Registered No. L. 4186

جلد ۲۸

عدد ۲

صفر ۱۳۶۵

۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام جمال پور- پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸؍

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کیگئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصّہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد (۳/۸) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

فہرست مضامین

جلد ۲۸ | بابت ماہ صفر ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۶ء | عدد ۲

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کر دی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ خلقت اور بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کا مستحق ہو اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلاف فطرت روش پر سزا پائے لیکن جہاں اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے وہیں بعض اعتبارات سے اس میں خلا[۱] بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کی ہدایت و ضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا نہ آخرت میں اس کو جزا و سزا دینے کے لیے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا بلکہ فطرت کے مقتضیات کے آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لیے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا
يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۶۵ ۔ نساء)

اور ہم نے بھیجے اپنے رسول خوش خبری دیتے ہوئے اور ہوشیار کرتے ہوئے تاکہ لوگوں کے پاس، ان رسولوں کے بعد، اللہ کے خلاف کوئی دلیل نہ باقی رہ جائے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا
مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ

اے اہل کتاب، انبیاء کے ایک وقفہ کے بعد، ہمارا رسول تمہارے پاس دین حق کو واضح کرتا ہوا آگیا ہے تاکہ تم (قیامت کے دن) یہ عذر نہ کر سکو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا

[۱] انسانی فطرت کے اندر جو خلا چھوڑا گیا ہے اور جس کی وجہ سے انسان انبیاء کی بے خطا رہنمائی کا محتاج ہوا اس پر ہم نے مفصل بحث اپنی کتاب "حقیقت رسالت" میں کی ہے جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے یہاں اس بحث میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔
(امین احسن)

بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ڈرانے والا نہیں آیا، (دیکھو) ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلق کو نیکی کا راستہ بتانے اور گمراہی سے بچانے اور لوگوں پر اپنی حجت پوری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے۔ اور محض اس لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہوجائے اور کجروی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، انبیاء کے بارہ میں سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثناء انسانوں میں سے آئے، فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں آئے۔ تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے مقتضیات انسانوں کے ذریعہ سے واضح ہوں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونہ کا کام دے سکتا ہے؟ اسی طرح بعض مستثنیٰ مثالوں کے سوا ہر قوم کے اندر، اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے لیے قبول حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قوم کے لوگوں پر اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہوسکے اور زبان بھی ایسی صاف ستھری استعمال کی جو ایچ پیچ سے بالکل پاک اور سب کے فہم سے قریب تر اور دلنشین تھی۔ پھر اللہ کے ان رسولوں نے یہ نہیں کیا کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی دعوت دے کر چھوڑ دیا ہو بلکہ اپنی زندگیاں اس مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دعوت دی ان باتوں کو خود بھی کرکے دکھا دیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان باتوں کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے اس کے بتانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ اپنی شرارتوں اور بدعملیوں کا الزام اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر نہ ڈال سکیں۔

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کرلیے کہ ساری دنیا کو ایک داعیٔ حق کی دعوت پر جمع کیا جاسکے اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا لیکن جب ان انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور اتنا بیدار ہوگیا کہ وہ ایک عالمگیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کرسکیں اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائل اجتماع و تمدن نے اس حد تک ترقی کرلی کہ ایک ہادی کا

پیغام ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو وہ مکمل نظام زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج، حالات اور ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظام زندگی ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح و مغز کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاء لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے۔ پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کے استعداد کے لحاظ سے دی تھی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد کی تعلیم نوع انسانی کے مبلغ ادراک کے لحاظ سے دی۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص مزاج اور خاص امراض کی بھی رعایت تھی لیکن اسلام کے قوانین میں صرف مزاج انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظام زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو نظام زندگی دنیا کو ملا وہ تمام نوع انسانی کی انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت و رہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمام حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایک بعثت خاص، دوسری بعثت عام۔ آپ کی بعثت خاص اہل عرب کی طرف تھی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی امی یا نبی عربی کہا گیا اور آپ پر جو وحی نازل ہوئی یا جو دعوت آپ نے دی اس کی زبان بھی عربی ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں یعنی تبلیغ اور اتمام حجت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست انجام دیں۔

آپ کی بعثت عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت عطا فرمائی اور اس امت کو یہ حکم دیا کہ رسول نے جس دین حق کی تبلیغ تم پر کی ہے اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تاکہ تم لوگوں پر (اللہ کے دین کی) گواہی دو، اور رسول تم پر

عَلَيْكُمْ شَهِيدًا	اللہ کے دین کی گواہی دے۔
وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم	اور میرے پاس اس قرآن کی وحی آئی ہے تاکہ میں اس کے
بِهِ وَمَن بَلَغَ	ذریعہ تم کو ہوشیار کروں اور جن کو یہ پہنچے (وہ دوسروں کو ہوشیار کریں)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت عام کے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک پوری امت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا تاکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوت حق ہمیشہ بلند ہوتی رہے اور دنیا کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ رہے جہاں کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہونے سے رہ جائے۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی اور ہدایت خلق اور اتمام حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لیے آپ کی امت پر ڈالی گئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیل سے محفوظ فرما دیا تاکہ دنیا کو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے لیے کسی نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ اس امت کے اندر جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے، ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کر دیا۔ اس طرح کی ایک جماعت (اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو) اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا زور کتنا ہی ہو لیکن ایک صالح جماعت آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کے علم و عمل کی شمع کبھی گل نہ ہونے دے گی جب ضلالت کا اثر اس امت کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ و ریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ یہ لوگ ان تاریک زمانوں میں بھی معروف کی دعوت دیں گے جب دنیا کا ضمیر اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور اہل بدعت کا اتنا زور ہوگا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائے گی لیکن یہ مخالفتوں کے باوجود اللہ کے رسول اور رسول کے صحابہ کے طریقہ پر قائم رہیں گے اور لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ دنیا کے ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ جس طرح علم وحی کو قرآن کی صورت میں

قیامت تک محفوظ کر دیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسول اور رسول کے صحابہ کے علم و عمل کو اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔ اور خلق کی ہدایت اور رسول کی حجت تمام کرنے کے لیے جو روشنی مطلوب ہے وہ کبھی گل ہونے نہ پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑی کے چراغ ہوں گے جن سے گم کردہ راہ قافلے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جا سکے گی

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی الناس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دینداری کے کام کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے مطلوب ہے بلکہ آنحضرت صلعم کی بعثت عام کا جو مقصد اس امت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے، یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل ہے۔ یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت صلعم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر ڈالا ہے اور اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں ادنیٰ کوتاہی بھی کریں، تو اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ان کو خیر امت کے منصب سے محروم کر دے اور دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے۔ کیونکہ آج خلق پر اتمام حجت کا ذریعہ یہی ہیں اگر یہ اتمام حجت نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر کر سکتی ہے کہ تو نے جن کو شہداء علی الناس بنایا تھا انھوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ پڑتے۔ اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

شہادت علی الناس یا تبلیغ عام کی یہ ذمہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے اور نہ ان الٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہو سکتی ہے جن پر پچھلے پرچہ میں ہم تنقید کر چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائگی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم اس کی ادائگی کی بعض ضروری شرطوں

کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں:

۱- اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دین حق کے شاہد ہیں، پہلے صدق دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے۔ اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے (اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ)۔ اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوتی تھیں خواہ وہ آباء واجداد کا دین ہو، قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو، اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو، سب سے دست بردار ہونے کے لیے وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کرتے تھے اور ان سارے خطرات میں 'انا اول المومنین' اور 'انا اول المسلمین' کہہ کر خود چھلانگ لگاتے تھے جو اس حق کو قبول کرنے کی وجہ سے سامنے آتے تھے۔

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو کہہ سکنے کے باوجود نہیں کہتا تو وہ "گونگا شیطان" ہے اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا (وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ الآیۃ)۔ اس معاملہ میں مصلحت بینی جو کچھ بھی ہونی چاہیے وہ نفس حق کے لحاظ سے ہونی چاہیے کہ حق کا اظہار صحیح طریق پر، صحیح محل میں، صحیح مخاطب کے سامنے ہو تاکہ دعوت حق کا تخم بارآور ہو۔ اگر آدمی حق کے سوا مجرد اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ایک امر حق کے اظہار سے جی چراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو یہ یا تو بے حمیتی اور بے غیرتی ہے یا نفاق۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ شہادت عمل سے دی جائے، صرف قول سے نہ دی جائے۔ جن لوگوں کا رویہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوتا تھا وہ آپؐ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں۔ جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت دیتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو ورنہ قطع نظر اس سے کہ اس کا یہ وعظ بے عمل بالکل بے اثر رہے گا یہ ایک کھلی ہوئی بے حیائی ہے۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویہ اور مسلک

اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ درحقیقت اپنی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے۔ اور عمل کی دلیل قول کی دلیل سے بہرحال قوی تر ہے۔ اس وجہ سے خود اس کا رویہ اس کے دعوے کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لیے کسی اور حجت کی ضرورت نہیں۔ مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں، اس کی دعوت بھی دیں اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسی پر عمل بھی کریں ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس سے انحراف کی کوئی شکل جائز نہیں بجز اس کے جو اللہ نے بیان کر دی ہے یعنی یا تو جہالت اور جذبات و شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم اس کے خلاف اٹھ جائے یا آدمی اس کے خلاف رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ پہلی صورت کی اصلاح کی تدبیر قرآن نے فوری توبہ بتائی ہے اور دوسری صورت کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس جبر سے نکلنے اور دین حق پر عمل کرنے کے لیے جد و جہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح حال کی جد و جہد کے بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور جس حالت اضطرار میں گرفتار ہو گیا تھا اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو وہ جس شہادت علی الناس پر مامور کیا گیا تھا اس کی اپنے عمل سے تکذیب کر رہا ہے۔

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی عصبیت سے بالاتر ہو کر دی جائے۔ نہ کسی قوم کی مخالفت، خواہ اس کی دشمنی ہمارے ساتھ کتنی ہی کھلی ہوئی کیوں نہ ہو، ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوا الآیۃ

اے ایمان والو اللہ کے لیے حق کی شہادت دینے والے بنو اور کسی قوم کی مخالفت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف سے ہٹ جاؤ

اور نہ کسی کی محبت و حمایت کا جذبہ، خواہ ہماری نسبت ان کے ساتھ کتنی ہی قریبی کیوں نہ ہو، اس راہ راست سے ہٹا سکے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ الآیۃ

اے ایمان والو حق کے برپا کرنے والے بنو اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے اگرچہ تمہارے اور تمہارے والدین اور اقربا کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔

۵۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو خدا کی طرف سے اترا ہے۔ کسی

ملامت و مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں ہے ان کی شہادت افراد دیں گے۔ اور جن چیزوں کی شہادت کے لیے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کے لیے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور جب وہ وجود میں آجائے تو اس کی شہادت دیں۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ (۶۷ - مائدہ)

(اے رسول جو (حق) تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس (پورے حق) کی تبلیغ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرض رسالت کو ادا نہیں کیا (اور مخالفوں کی پروا نہ کرو) اللہ لوگوں کے شر سے تمہاری حفاظت کرے گا۔

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ (احزاب ۳۹)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۴۸ - احزاب)

اور کافروں اور منافقوں کی بات پر دھیان نہ کر، ان کی ایذا رسانیوں سے درگزر کر اور اللہ پر بھروسہ کر۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ (الشوریٰ ۲)

پس اسی راہ کی دعوت دے اور اسی پر جما رہ اور ان کی بدعتوں کی پیروی نہ کر اور کہہ دے کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔

۶۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو، اللہ کے دین کی شہادت جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو، جنھوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لیے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی، ان کو شہید کہا گیا۔ اور غور کیجیے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لیے موزوں ہو سکتا۔ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان

میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر پائے گا لیکن جنھوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے اور ان کی موت پر ہزاروں لاکھوں زندگیاں نثار ہوں۔

یہ فریضۂ رسالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پوری امت پر ڈالا گیا ہے اور یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو "خیر امت" کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم ہیں، نہ ان کے لیے کوئی خیریت ہے نہ کوئی فضیلت اور نہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۱۱۰۔ آل عمران)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو نیکی کا حکم دیتے ہوئے، برائی سے روکتے ہوئے، اور اللہ پر ایمان لاتے ہوئے۔

اس جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۰۴۔ آل عمران)

اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے، اور منکر سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اسی لیے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس امت پر ڈالا گیا تھا۔

جب تک یہ ادارہ صحیح نہج پر قائم رہا اور اپنے فرائض، امت کے اندر اور امت سے باہر، انجام دیتا رہا ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا

فرض ایک فرض کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عنداللہ بری کر دیتا تھا۔

لیکن جس طرح کسی ملک کی حکومت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس ملک کے ہر باشندے کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس پر منتقل ہو جاتی ہے اور اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ حفظ جان و مال کے اس جماعتی نظم کو وجود میں لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے جو درہم برہم ہو گیا ہے اور جب تک وہ وجود میں نہ آجائے چین کی نیند نہ سوئے بلکہ اپنے اور دوسروں کے جان و مال کی ساری بربادیوں کی ذمہ داری اپنے اوپر سمجھے اسی طرح مسلمانوں کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے جماعتی فرض کی ادائگی کے اس ادارہ کے درہم برہم ہو جانے کے بعد چین کی نیند سوئیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اس امت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے یہاں مسئول اور گنہگار ہوگا۔ جماعتی فرائض کی ادائگی کے لیے جب جماعتی ادارہ باقی نہ رہ جائے تو ان کی ذمہ داری جماعت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور اس صورت میں اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کی ان کے لیے دو ہی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو اس نظم کو از سر نو وجود میں لائیں یا کم از کم اسکو وجود میں لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں اس کے سوا اور کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

الف: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ امت ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

ب: اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط ہے کہ یہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے، بلا تقسیم و تفریق پورے دین کی کی جائے، بے خوف لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے، اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

ج: اس جماعتی فرض کی ادائگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

د: اس ادارہ کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

ھ: اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اسکو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

و: اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات بھی نہ کریں تو وہ اس فرض رسالت کو ادا کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر لیں گے بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرک درحقیقت اس فرض عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے۔ اور اس میں جو چیز بطور مطمح نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظام دعوت خیر پھر وجود میں آجائے جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمام حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم، سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے۔ اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیے، اسی کے لیے کھانا اور پینا چاہیے، اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہیے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انھوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصد وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو "امت وسط" یا "خیر امت" کے لقب کا مستحق سمجھیں۔

تفہیم القرآن

(۳۳)

یونس

(از ابتدا تا وسط رکوع ۱)

اس سورہ کا نام حسب دستور محض علامت کے طور پر دسویں رکوع کی اُس آیت سے لیا گیا ہے جس میں اشارۃً حضرت یونس کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا موضوع بحث حضرت یونس کا قصہ نہیں ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے اور نفس مضمون سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ پوری سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ اس کی بعض آیتیں مدنی دور کی ہیں، لیکن یہ محض ایک سطحی قیاس ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ مختلف تقریروں یا مختلف مواقع پر اتری ہوئی آیتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ شروع سے آخر تک ایک ہی مربوط تقریر ہے جو بیک وقت نازل ہوئی ہوگی، اور مضمون کلام اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ یہ مکی دور کا کلام ہے۔

زمانۂ نزول کے متعلق کوئی روایت ہمیں نہیں ملی۔ لیکن مضمون سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ زمانۂ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ اس کے انداز کلام سے صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مخالفینِ دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر چکی ہے، وہ نبی اور پیروانِ نبی کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان سے اب یہ امید باقی نہیں رہی ہے کہ تفہیم و تلقین سے راہ راست پر آجائیں گے، اور اب انھیں اس انجام سے خبردار کرنے کا موقع آگیا ہے جو نبی کو آخری اور قطعی طور پر رد کر دینے کی صورت میں انھیں لازماً دیکھنا ہوگا۔ مضمون کی یہی خصوصیات ہمیں بتاتی ہیں کہ کونسی سورتیں مکہ کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اس سورہ میں ہجرت کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، اس لیے اس کا زمانہ اُن سورتوں سے پہلے کا سمجھنا چاہیے جن میں کوئی

ذکوئی خفی یا جلی اشارہ ہم کو ہجرت کے متعلق ملتا ہے ـــــ زمانہ کی اس تعیین کے بعد تاریخی پس منظر بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس دور کا تاریخی پس منظر سورۂ انعام اور سورۂ اعراف کے دیباچہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

موضوع تقریر دعوت، فہمائش اور تنبیہ ہے۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ:

لوگ ایک انسان کے پیغام نبوت پیش کرنے پر حیران ہیں اور اسے خواہ مخواہ ساحری کا الزام دے رہے ہیں، حالانکہ جو بات وہ پیش کر رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی نہ تو عجیب ہی ہے اور نہ سحر و کہانت ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ تو دو اہم حقیقتوں سے تم کو آگاہ کر رہا ہے۔ ایک یہ کہ جو خدا اس کائنات کا خالق ہے اور اس کا انتظام عملاً چلا رہا ہے صرف وہی تمہارا مالک و آقا ہے اور تنہا اسی کا یہ حق ہے کہ تم اس کی بندگی کرو۔ دوسری یہ کہ موجودہ دنیوی زندگی کے بعد زندگی کا ایک اور دور آنے والا ہے جس میں تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے، اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دو گے، اور اس بنیادی سوال پر جزا یا سزا پاؤ گے کہ تم نے اسی خدا کو اپنا آقا مان کر اس کے منشا کے مطابق نیک رویہ اختیار کیا یا اس کے خلاف عمل کرتے رہے۔ یہ دونوں حقیقتیں جو وہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے بجائے خود امر واقعی ہیں خواہ تم مانو یا نہ مانو۔ وہ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تم انہیں مان لو اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق بنا لو۔ اس کی یہ دعوت اگر تم قبول کرو گے تو تمہارا اپنا انجام بہتر ہوگا ورنہ خود ہی برا نتیجہ دیکھو گے۔

اس تمہید کے بعد حسب ذیل مباحث ایک خاص ترتیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں:

(۱) وہ دلائل جو توحید ربوبیت اور حیات اخروی کے باب میں ایسے لوگوں کو عقل و ضمیر کا اطمینان بخش سکتے ہیں جو جاہلانہ تعصب میں مبتلا نہ ہوں اور جنہیں بحث کی ہار جیت کے بجائے اصلی فکر اس بات کی ہو کہ خود غلط بینی اور اس کے برے نتائج سے بچیں۔

(۲) اُن غلط فہمیوں کا ازالہ اور اُن غفلتوں پر تنبیہ جو لوگوں کو توحید اور آخرت کا عقیدہ تسلیم کرنے میں مانع ہو رہی تھیں (اور ہمیشہ ہوا کرتی ہیں)۔

(۳) اُن شبہات اور اعتراضات کا جواب جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کے

لائے ہوئے پیغام پر پیش کیے جاتے تھے۔

(۴) دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی پیشگی خبر تاکہ انسان اس سے ہوشیار ہو کر اپنے آج کے طرزِ عمل کو درست کرے اور بعد میں پچھتانے کی نوبت نہ آئے۔

(۵) اس امر پر تنبیہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی زندگی ہے اور اس امتحان کے لیے تمھارے پاس بس اتنی ہی مہلت ہے جب تک تم اس دنیا میں سانس لے رہے ہو۔ اس وقت کو اگر تم نے ضائع کر دیا اور نبی کی ہدایت قبول کر کے امتحان کی کامیابی کا سامان نہ کیا تو پھر کوئی دوسرا موقع تمھیں ملنا نہیں ہے۔ اس نبی کا آنا اور اس قرآن کے ذریعہ تم کو علمِ حقیقت کا بہم پہنچایا جانا وہ بہترین اور ایک ہی موقع ہے جو تمھیں مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے تو بعد کی ابدی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ پچھتاؤ گے۔

(۶) اُن کھلی کھلی جہالتوں اور ضلالتوں پر اشارہ جو لوگوں کی زندگی میں صرف اس وجہ سے پائی جاتی تھیں کہ وہ خدائی ہدایت کے بغیر جی رہے تھے۔

اس سلسلہ میں نوح علیہ السلام کا قصہ مختصراً اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے چار باتیں ذہن نشین کرنی مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ تم لوگ کر رہے ہو وہ اُس سے ملتا جلتا ہے جو نوح اور موسیٰ علیہم السلام کے ساتھ تمھارے پیش رو کر چکے ہیں اور یقین رکھو کہ اس طرزِ عمل کا جو انجام وہ دیکھ چکے ہیں وہی تمھیں بھی دیکھنا پڑے گا۔ دوسری یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو آج جس بے بسی و کمزوری کے حال میں تم دیکھ رہے ہو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ صورتِ حال ہمیشہ یہی رہے گی۔ تمھیں خبر نہیں ہے کہ ان لوگوں کی پشت پر وہی خدا ہے جو موسیٰؑ و ہارونؑ کی پشت پر تھا اور وہ ایسے طریقہ سے حالات کی بساط الٹ دیتا ہے جس تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ تیسری یہ کہ سنبھلنے کے لیے جو مہلت خدا تمھیں دے رہا ہے اسے اگر تم نے ضائع کر دیا اور پھر فرعون کی طرح خدا کی پکڑ میں آجانے کے بعد عین آخری لمحے پر توبہ کی تو معاف نہیں کیے جاؤ گے۔ چوتھی یہ کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے وہ مخالف ماحول کی

انتہائی شدت اور اس کے مقابلہ میں اپنی بیچارگی دیکھ کر مایوس نہ ہوں اور انھیں معلوم ہو کہ ان حالات میں ان کو کس طرح کام کرنا چاہیے، نیز وہ اس امر پر بھی متنبہ ہو جائیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اس حالت سے نکال دے تو کہیں وہ اُس روش پر نہ چل پڑیں جو بنی اسرائیل نے مصر سے نجات پا کر اختیار کی۔

آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ مسلک ہے جس پر چلنے کی اللہ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کی ہے، اس میں قطعاً کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی، جو اسے قبول کرے گا وہ اپنا بھلا کرے گا اور جو اس کو چھوڑ کر غلط راہوں میں بھٹکے گا وہ اپنا ہی کچھ بگاڑے گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

الٓر۔ یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے[1]۔

کیا لوگوں کے لیے یہ عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں اُن کو خوشخبری دیدے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت و سرفرازی ہے[2]؟ (کیا یہی وہ بات ہے جس پر) منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا

---

[1] اس تمہیدی فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مضمر ہے۔ نادان لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ پیغمبر قرآن کے نام سے جو کلام ان کو سنا رہا ہے وہ محض زبان کی جادوگری ہے، شاعرانہ پرواز تخیل ہے اور کچھ کاہنوں کی طرح عالم بالا کی گفتگو ہے۔ اس پر انھیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم گمان کر رہے ہو یہ وہ چیز نہیں ہے۔ یہ تو کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ ان کی طرف توجہ نہ کرو گے تو حکمت سے محروم رہ جاؤ گے۔

[2] یعنی آخر اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ انسانوں کو ہوشیار کرنے کے لیے انسان نہ مقرر کیا جاتا تو کیا فرشتہ یا جن یا حیوان مقرر کیا جاتا؟ اور اگر انسان حقیقت سے غافل ہو کر غلط طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو تعجب کی بات یہ ہوتی کہ ان کا خالق و پروردگار انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا یا یہ کہ وہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی انتظام کرتا؟ اور اگر خدا کی طرف سے کوئی ہدایت آئے تو عزت و سرفرازی اُن کے لیے ہونی چاہیے جو اسے مان لیں یا ان کے لیے جو اسے رد کر دیں؟ پس تعجب کرنے والوں کو سوچنا تو چاہیے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس پر وہ تعجب کر رہے ہیں۔

جادوگر ہے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب[۲] وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[۳]، پھر تخت

---

[۱] یعنی جادوگری کی پھبتی تو انھوں نے اس پر کس دی مگر یہ نہ سوچا کہ وہ چسپاں بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ صرف یہ بات کہ کوئی شخص خطابت سے کام لے کر لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کر رہا ہے، اس پر یہ الزام عائد کر دینے کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ جادوگری کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس خطابت میں وہ بات کیا کہتا ہے، کس غرض کے لیے قوت تقریر کو استعمال کر رہا ہے اور جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔ جو خطیب محض لوگوں کو مسحور کرنے کے لیے زبان آوری کے جوہر دکھاتا ہے وہ تو ایک منہ پھٹ، بے لگام، غیر ذمہ دار مقرر ہوتا ہے۔ حق اور صداقت اور انصاف سے آزاد ہو کر ہر وہ بات کہہ ڈالتا ہے جو بس سننے والوں کو متاثر کر دے، خواہ بجائے خود کتنی ہی جھوٹی، مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ ہو۔ اس کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی، کسی منظم فکر کے بجائے تناقض اور ناہمواری، اور اعتدال کے بجائے بے اعتدالی ہوتی ہے۔ وہ یا تو محض اپنا سکہ جمانے کے لیے زبان درازی کرتا ہے، یا پھر لوگوں کو لڑانے اور ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلہ میں ابھارنے کے لیے خطابت کی شراب پلاتا ہے۔ اس کے اثر سے لوگوں میں نہ کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیر رونما ہوتا ہے اور نہ کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت وجود میں آتی ہے، بلکہ اس کے برعکس لوگ پہلے سے بدتر صفات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو کلام پیش کر رہا ہے اس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظام فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق و صداقت کا سخت التزام ہے، لفظ لفظ جچا تلا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے۔ اس کی خطابت میں تم خلق خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں اس کی اپنی ذاتی یا خاندانی یا قومی یا کسی قسم کی دنیوی غرض کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لوگ جس غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کے برے نتائج سے ان کو خبردار کرے اور انہیں اس طریقے کی طرف بلائے جس میں ان کا اپنا بھلا ہے۔ پھر اس کی تقریر سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بھی جادوگروں کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں جس نے بھی اس کا اثر قبول کیا ہے اس کی زندگی سنور گئی ہے، وہ پہلے سے زیادہ بہتر اخلاق کا انسان بن گیا ہے اور اس کے سارے طرز عمل میں خیر و صلاح کی شان نمایاں ہو گئی ہے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کیا جادوگر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور ان کا جادو ایسے ہی نتائج دکھایا کرتا ہے؟

[۲] رب کا لفظ یہاں پروردگار، مالک، آقا اور فرمانروا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ربوبیت اپنے

(باقی صفحہ ۷۴ پر)

حکومت پر متمکن ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے[۵۱]۔ کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں ہے الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے[۵۲]۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو[۵۳]۔ پھر کیا تم ہوش میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳) جو مخصوصات کے ساتھ صرف خدا کے لیے مخصوص ہے۔ وہی تمہارا پروردگار ہے۔ تمہیں پرورش کرنے اور پروان چڑھانے میں اور تمہاری نگہبانی کرنے میں کوئی اس کا شریک کار نہیں ہے۔ وہی تمہارا مالک و آقا ہے۔ کسی دوسرے کو تم پر ملکیت و بالاتری و آقائی کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ وہی تمہارا فرمانروا ہے۔ کوئی دوسرا یہ حق نہیں رکھتا کہ تم اس کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرو۔ یہ نبی کی تعلیم کا اولین بنیادی اصول ہے۔

[۵۰] دن سے مراد وہ دن نہیں ہے جو سورج کے سامنے زمین کی محوری حرکت سے حاصل ہوتا ہے بلکہ کائناتی دن ہے جو ممکن ہے ہمارے حساب سے پچاس ہزار سال کا ہو اور ممکن ہے کہ اس سے کم یا زیادہ ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی پیدا کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی کائنات کے تخت سلطنت پر وہ خود متمکن ہوا اور اب سارے جہان کا انتظام عملاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نادان لوگ سمجھتے ہیں خدا نے کائنات کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دیا ہے کہ خود جس طرح چاہے چلتی رہے یا دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں جیسا چاہیں تصرف کریں۔ قرآن اس کے برعکس یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کی اس پوری کارگاہ پر آپ ہی حکمرانی کر رہا ہے، تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں، ساری زمام اقتدار پر وہ خود قابض ہے، کائنات کے گوشے گوشے میں ہر وقت ہر آن جو کچھ ہو رہا ہے براہ راست اس کے حکم و اشارے سے ہو رہا ہے، اس جہان ہستی کے ساتھ اس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کبھی اسے وجود میں لایا تھا، بلکہ ہر وقت وہی اس کا مدبر و منتظم ہے، اسی کے قائم رکھنے سے یہ قائم ہے اور اسی کے چلانے سے یہ چل رہا ہے۔

[۵۲] یعنی دنیا کی تدبیر و انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کر کے اس کا کوئی فیصلہ بدلوا دے یا کسی کی قسمت بنوا دے یا بگڑوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ خدا سے دعا کرے۔ مگر اس کی دعا کا قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل خدا کے اختیار میں ہے، خدا کی خدائی میں اتنا زوردار کوئی نہیں ہے کہ اس کی بات چل کر رہے اور اس کی سفارش ٹل نہ سکے۔

[۵۳] اوپر کے تین فقروں میں حقیقت نفس الامر کا بیان تھا کہ فی الواقع خدا ہی تمہارا رب ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امر واقعی کی موجودگی میں تمہارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ جب واقعہ یہ ہے کہ ربوبیت بالکلیہ خدا کی ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم صرف اسی کی
(باقی صفحہ ۵۰ پر)

نہ آؤ گے؟ [۱]

اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔[۲] یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتدا وہی کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا[۳] تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پییں اور دردناک سزا بھگتیں اُس انکارِ حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے۔[۴]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴) عبادت کرو۔ پھر جس طرح ربوبیت کا لفظ تین مفہومات پر مشتمل ہے، یعنی پروردگاری، مالکی و آقائی، اور فرمانروائی، اسی طرح اس کے بالمقابل عبادت کا لفظ بھی تین مفہومات پر مشتمل ہے، یعنی پرستش، غلامی اور اطاعت۔

خدا کے واحد پروردگار ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اسی کا شکرگزار ہو، اسی سے دعائیں مانگے، اور اسی کے آگے محبت و عقیدت سے سر جھکائے۔ یہ عبادت کا پہلا مفہوم ہے۔

خدا کے واحد مالک و آقا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کا بندہ و غلام بن کر رہے، اُس کے مقابلہ میں خود مختارانہ رویہ نہ اختیار کرے اور اس کے سوا کسی اور کی ذہنی یا عملی غلامی نہ قبول کرے۔ یہ عبادت کا دوسرا مفہوم ہے۔

خدا کے واحد فرمانروا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرے، نہ خود اپنا حکمران بنے اور نہ اس کے سوا کسی دوسرے کی حکمرانی تسلیم کرے۔ یہ عبادت کا تیسرا مفہوم ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱؎ یعنی جب یہ حقیقت تمہارے سامنے کھول دی گئی اور تم کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اس حقیقت کی موجودگی میں تمہارے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے تو کیا اب بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں گی اور انہی غلط فہمیوں میں پڑے رہو گے جن کی بنا پر تمہاری زندگی کا پورا رویہ اب تک حقیقت کے خلاف رہا ہے؟

۲؎ یہ نبی کی تعلیم کا دوسرا بنیادی اصول ہے

۳؎ یہ فقرہ دعوے اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ خدا دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا اور اس پر دلیل یہ دی گئی ہے کہ اسی نے پہلی مرتبہ انسان کو پیدا کیا۔ جو شخص یہ تسلیم کرتا ہو کہ خدا نے خلق کی ابتدا کی ہے (اور اس سے بجز اُن دہریوں کے اور کون منکر ہے جو محض پادریوں کے مذہب سے بھاگنے کے لیے خلقِ بے خالق جیسے احمقانہ نظریے کو اوڑھنے پر آمادہ ہو گئے) وہ اس بات کو ناممکن یا بعید از فہم نہیں قرار دے سکتا کہ وہی خدا اس خلق کا اعادہ کرے گا۔

۴؎ یہ وہ ضرورت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ اوپر جو دلیل دی گئی تھی وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ خلق کا اعادہ ممکن ہے اور اسے مستبعد سمجھنا درست نہیں ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اعادۂ خلق عقل و انصاف کی رو سے ایک ایسی ضرورت ہے

(باقی صفحہ ۷۷ پر)

وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں کہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرتے ہو۔ اللہ نے یہ سب کچھ (کھیل کے طور پر نہیں بلکہ) بامقصد ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غلط بینی و غلط روی سے) بچنا چاہتے ہیں۔[۱۰]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵) جو تخلیقِ ثانیہ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پوری نہیں ہوتی۔ خدا کو اپنا واحد رب مان کر جو لوگ صحیح بندگی کا رویہ اختیار کریں وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں اپنے اس بجا طرزِ عمل کی پوری پوری جزا ملے، اور جو لوگ حقیقت سے انکار کر کے اس کے خلاف زندگی بسر کریں وہ بھی اس کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے اس بیجا طرزِ عمل کا برا نتیجہ دیکھیں۔ یہ ضرورت اگر موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں ہو رہی ہے (اور ہر شخص جو ہٹ دھرم نہیں ہے جانتا ہے کہ نہیں ہو رہی ہے) تو اسے پورا کرنے کے لیے یقیناً دوبارہ زندگی ناگزیر ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱۰] یہ عقیدۂ آخرت کی تیسری دلیل ہے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے جو کام ہر طرف نظر آ رہے ہیں جن کے بڑے بڑے نشانات سورج اور چاند اور لیل و نہار کی گردش کی صورت میں ہر شخص کے سامنے موجود ہیں، ان سے اس بات کا نہایت واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس عظیم الشان کارگاہِ ہستی کا خالق کوئی بچہ نہیں ہے جس نے محض کھیلنے کے لیے یہ سب کچھ بنایا ہو اور پھر دل بھر لینے کے بعد یونہی اس گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالے۔ صریح طور پر نظر آ رہا ہے کہ اس کے ہر کام میں تنظیم ہے، حکمتیں ہیں، مصلحتیں ہیں، اور ذرے ذرے کی پیدائش میں ایک گہری مقصدیت پائی جاتی ہے۔ پس جب وہ حکیم ہے اور اس کی حکمت کے آثار و علائم تمہارے سامنے علانیہ موجود ہیں، تو اس سے تم کیسے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ انسان کو عقل اور اخلاقی حس اور آزادانہ اختیار بخشنے کے بعد اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب کبھی نہ لے گا، اور عقلی و اخلاقی ذمہ داری کی بنا پر جزا و سزا کا جو استحقاق لازماً پیدا ہوتا ہے اسے یونہی مہمل چھوڑ دے گا۔

اس طرح ان آیات میں عقیدۂ آخرت پیش کرنے کے ساتھ اس کی تین دلیلیں بھی ٹھیک ٹھیک منطقی ترتیب کے ساتھ دی گئی ہیں:-

اوّل یہ کہ دوسری زندگی ممکن ہے کیونکہ پہلی زندگی کا امکان واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔

دوم یہ کہ دوسری زندگی کی ضرورت ہے، کیونکہ پہلی زندگی میں انسان اپنی اخلاقی ذمہ داری کو صحیح یا غلط طور پر جس طرح

باقی صفحہ ۷۷ پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) ادا کرتا ہے اور اس سے سزا و جزا کا جو استحقاق پیدا ہوتا ہے اس کی بنا پر عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسری زندگی ہو جس میں ہر شخص اپنے اخلاقی رویہ کا وہ نتیجہ دیکھے جس کا وہ مستحق ہے۔

سوم یہ کہ جب عقل و انصاف کی رو سے دوسری زندگی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت یقیناً پوری کی جائے گی کیونکہ انسان اور کائنات کا خالق حکیم ہے اور حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ حکمت و انصاف جس چیز کے متقاضی ہوں اسے وہ وجود میں لانے سے باز رہ جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی بعد موت کو استدلال سے ثابت کرنے کے لیے یہی تین دلیلیں ممکن ہیں اور یہی کافی بھی ہیں۔ ان دلیلوں کے بعد اگر کسی چیز کی کسر باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کو آنکھوں سے دکھا دیا جائے کہ جو چیز ممکن ہے، جس کے وجود میں آنے کی ضرورت بھی ہے، اور جس کو وجود میں لانا خدا کی حکمت کا تقاضا بھی ہے، وہ دیکھ یہ تیرے سامنے موجود ہے۔ لیکن یہ کسر بہرحال موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں کی جائے گی، کیونکہ دیکھ کر ایمان لانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ انسان کا جو امتحان لینا چاہتا ہے وہ تو ہے ہی یہ کہ وہ حس و مشاہدہ سے بالاتر حقیقتوں کو خالص نظر و فکر اور استدلال صحیح کے ذریعہ سے مانتا ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مضمون بھی بیان فرما دیا گیا ہے جو گہری توجہ کا مستحق ہے۔ فرمایا کہ "اللہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں" اور "اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غلط بینی و غلط روی سے بچنا چاہتے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے زندگی کے مظاہر میں ہر طرف وہ آثار پھیلا رکھے ہیں جو ان مظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کی صاف صاف نشان دہی کر رہے ہیں۔ لیکن ان نشانات سے حقیقت تک صرف وہ لوگ رسائی حاصل کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ دو صفات موجود ہوں:

ایک یہ کہ وہ جاہلانہ تعصبات سے پاک ہو کر علم حاصل کرنے کے اُن ذرائع سے کام لیں جو اللہ نے انسان کو دیے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان کے اندر خود یہ خواہش موجود ہو کہ غلطی سے بچیں اور صحیح طریق اختیار کریں۔

مقالات

مقتضیات ایمان

(جناب مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری)

(۲)

ایمانیات خمسہ اور ان کی ضروری تشریح

قرآن نے تمام انسانوں کے لیے جو نظام شرعی پیش کیا ہے۔ اس میں افکار، اعمال، معاملات اور انفرادی واجتماعی حالات کے لیے پانچ امور مقرر کردیے ہیں جن کی بنیاد پر ساری عمارت کھڑی ہے۔ یہ نہ ہوں تو پھر کسی قسم کی کوئی تعمیر ہو ہی نہیں سکتی اور ان پانچوں میں اتنی شدید اور پرزور وابستگی ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے کسی حال میں علیحدہ نہیں کرسکتے۔ ان پانچوں میں سب سے پہلے وہ حقیقت ہے جو بقیہ چاروں کے لیے اساس کا کام دیتی ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کریجیے تو پھر کسی کا بھی باقی رہنا ممکن نہیں۔ وہ پانچ امور یہ ہیں:-

اولاً اللہ پر ایمان لانا، ثانیاً فرشتوں پر ایمان لانا، ثالثاً اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا، رابعاً اللہ کے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا، خامساً یوم آخرت اور جزاو سزا پر ایمان لانا۔

ان میں سے ہر ایک پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کا دوسرے سے مضبوط رشتہ کیوں ہے؟ فرشتوں پر ایمان اسی لیے تو ہے کہ وہی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی وحی کا اولین وسیلہ ہیں۔ رسولوں پر ایمان اسی لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے مبعوث ہو کر آئے ہیں، اللہ ہی کے پیغام کی اپنے ہر قول اور فعل سے ترجمانی کرتے ہیں، اللہ ہی کی مرضی کے نمائندے بن کر حق کی دعوت دیتے اور انسانی زندگی کے لیے صحیح رویہ متعین کرتے ہیں۔ یوم آخرت اور اس کی جزا پر ایمان بھی اسی حیثیت سے قابل لحاظ ہے کہ اس دن اللہ کے عدل و انصاف کا کامل مظاہرہ ہوگا، حس و عقل کے سارے پردے اٹھ جائیں گے، سچے

ایماندار اور منافق و کافر سب الگ الگ کر دیے جائیں گے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

ایمان باللہ کیا ہے؟

اللہ پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے؟ اللہ اور اس کی ذات و صفات کو ٹھیک ٹھیک اسی طرح مان لینا جس طرح انھیں ماننے کی قرآن نے تلقین کی ہے۔ صرف اس حد تک مان لینا نہیں کہ کوئی مافوق الطبیعت، سب سے بڑی اور سب سے اونچی ہستی موجود ہے جس کی قوت ایجاد سے یہ پوری کائنات وجود پذیر ہوئی ہے اور وہ دنیا کو پیدا کرنے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر علیحدہ بیٹھ گئی ہے۔ کائنات کے نظم و نسق اور اس کے بننے بگڑنے سے اس کو کوئی سروکار نہیں رہا۔ دنیا و مافیہا سے اس کا تعلق بس اسی حد تک ہے کہ وہ آسمان و زمین اور علوی و سفلی مخلوقات کو پیدا کرنے والی ہے۔ انسان کے معاملات اور اس کی زندگی کے حالات سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی کی مشین کو باضابطہ اور باقاعدہ چلانے کے لیے انسان کی حس و عقل اور وجدان کی قوتیں کافی ہیں۔ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنی انفرادی و اجتماعی، معاشی و سیاسی ہر قسم کی ضروریات کے لیے وہ اپنا نظام کار بنا کر اس کو کامیابی کے ساتھ چلا سکتا ہے۔ ہاں چونکہ ایک امر واقعہ کی حیثیت سے ایک خدا بھی ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے اس لیے اسے بھی مانتے رہنا چاہیے۔ اس طرح کا ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہے اور اس طرح کا ماننا ہرگز ایمان باللہ نہیں ہے جس کا مطالبہ قرآن مجید کرتا ہے۔

الوہیت

اس طرح اللہ کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔ ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ قرآن نے جن قوموں میں انبیاء کی بعثت کا ذکر کیا ہے ان میں "عدم ایمان" اس معنی میں نہیں تھا کہ وہ اللہ کو خالق کائنات اور خالق ارض و سماوات نہ مانتے ہوں۔ قرآن نے نہایت صاف صاف لفظوں میں اسی معنی کے لحاظ سے انہیں اللہ کو ماننے والا تسلیم کر کے ان کو تنبیہ کی ہے کہ یہ ماننا کافی نہیں ہے۔ یہاں ہم قرآن کی چند آیتیں پیش کیے دیتے ہیں جن کے مطالعہ سے بالکل غیر مشتبہ طور پر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی اور اس بارے میں جو طرح طرح کے مغالطے لوگوں کو ہیں وہ دور ہو کر حق کی روشنی نمودار ہو جائے گی۔

سورہ مومنون میں ارشاد فرمایا جاتا ہے:-

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ

دریافت کرو کہ ساری زمین اور جو کچھ بھی اس میں ہے آخر وہ کس کی ملک ہے اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ، وہ کہیں گے اللہ کی ملک۔ تو کہو کیا تم نصیحت پذیر نہیں ہوتے؟ ان سے کہو ساتوں

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؕ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ؕ (مومنون - ۲)

آسمانوں اور بڑے عرش کا مالک کون ہے؟ وہ کہیں گے کہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ پوچھو کہ جب ایسا ہے تو پھر کیوں اس کا تقویٰ نہیں اختیار کرتے ہو۔ ان سے دریافت کرو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہی پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا پناہ نہیں دے سکتا، اگر تم کو علم ہے؟ وہ پھر یہی کہیں گے کہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے۔ تو پھر کہو کہ تم کہاں بھٹکائے جا رہے ہو۔

اور ایک جگہ فرمایا ہے :-

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (عنکبوت - ۲)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے؟ وہ یقیناً کہیں گے اللہ ہی نے (یہ سب کچھ کیا ہے) تو پھر یہ لوگ کہاں بھٹکائے جا رہے ہیں۔

اور ایک مقام پر فرمایا گیا ہے :-

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (عنکبوت - ۶)

اور اگر تم ان سے سوال کرو کہ اوپر سے پانی کس نے برسایا کہ زمین مردہ کو اس کے ذریعہ زندہ کر ڈالا ہو تو ضرور وہ کہیں گے کہ اللہ ہی نے یہ کیا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (زخرف - ۷)

اور اگر ان سے پوچھو کہ کس نے ان کو پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ ہی نے، تو پھر یہ لوگ کہاں بھٹکائے جا رہے ہیں؟

قرآن مجید کی ان آیتوں سے یہ بات صریحاً معلوم ہو رہی ہے کہ جہاں جہاں انسانی آبادیوں میں اللہ کی طرف سے اس کے رسول اور پیغمبر بھیجے گئے تھے وہاں کے لوگوں کو اللہ کے وجود کا یا اس کے مدبر ہونے کا یا اس کی تخلیق و تکوین کا انکار نہ تھا۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ آسمانوں، زمین اور ہر چیز کا پیدا کرنیوالا اللہ ہی ہے۔ انھیں اس امر کا اعتراف تھا کہ خود ان کو خلعت وجود سے نوازنے والا اللہ ہی ہے۔ وہ یہ بھی اقرار کرتے تھے کہ زندگی کے تمام سر و سامان جو ان

کے لیے لازمی ہیں، اللہ ہی کی عنایت وبخشش کا ثمرہ ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے اقرار و اعتراف کے باوجود وہ اللہ پر ایمان اس اعتبار سے لانے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہی اللہ ان کا تنہا معبود اور اکیلا حقیقی مالک بھی ہے۔ تمام خداؤں کی خدائی اور سارے آقاؤں کی آقائی چھوڑ کر، سب کی حکم برداری، فرماں پذیری اور تسلیم و اطاعت سے منہ موڑ کر صرف اس ایک ان دیکھے خدا کو اس طرح ان لیا جائے کہ اسی کے آگے سر نیاز جھکا کر جبہ سائی کرنے لگ جائیں اسی کی بے شرط اطاعت گزاری قبول کر لی جائے۔ اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کی تمام خواہشات و میلانات سے بکلی دست بردار ہو کر ہر طرح سے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ الوہیت کا دراصل یہی مفہوم تھا جو ہر جہت سے کامل و جامع تھا اور سارے رسولوں، نبیوں اور پیغمبروں نے دنیا والوں کو اسی کی طرف دعوت دی، لیکن انھیں اس پر تعجب ہی رہا اور وہ برابر یہی کہتے رہے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ — کیا اس رسول نے سارے الہوں کا ایک الہ بناڈالا، یہ تو بہت ہی عجیب چیز ہے۔

انھیں بار بار سمجھایا اور بتایا گیا کہ معبود برحق اور الہ حقیقی تو ایک ہی ہے

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ — بے شک تم سب کا معبود ایک ہی "الہ" ہے۔

لیکن مشرکین اس حیثیت سے خدا کو ماننے پر راضی نہ ہوئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت ان تمام مفہوموں کے ساتھ ماننی چاہیے جو الوہیت کے لفظ کے اندر مضمر ہیں اور جو اس سے لازم آتے ہیں۔ اسی طرح کے ماننے سے انسانی زندگی میں وہ انقلاب رونما ہوتا ہے جس کا برپا کرنا قرآن کا مقصد ہے۔ یہ چیز جب مقصدی حیثیت سے ذہن نشین ہو جاتی ہے تو اپنے آپ کو انسان اپنے معبود حقیقی کا بندہ، رعیت اور غلام محسوس کرتا ہے اور اسی کی غلامی میں اپنے تمام اوقات اپنی ساری طاقتوں، اپنے دل و دماغ کی سب قوتوں، اپنے اعضاء و جوارح کی ایک ایک نقل و حرکت کو صرف کرتا ہے۔ اس طرح جب اللہ پر ایمان لایا جاتا ہے تو پناہ بھی اسی کی ڈھونڈی جاتی ہے، کسی اور کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا اور اللہ کے تعلق میں سچا روحانی سکون، قلبی اطمینان و چین نصیب ہوتا ہے۔ راحت ہو یا مصیبت، آرام ہو یا تکلیف، بیماری ہو یا صحت، فارغ البالی ہو یا مفلسی، ہر لمحہ اس کے ساتھ

وابستگی رہتی ہے۔ اگرچہ اللہ اپنی ذات کے لحاظ سے نہ سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ عقل وادراک ہی سے اس کا احاطہ کر لینا ممکن ہے۔ مگر حقیقی مومن باللہ اس کی تجلیات و انوار، اس کی صفات کاملہ کی کرشمہ سازیاں، اس کی قدرت قاہرہ کی نیرنگیاں آفاق و انفس میں، دیکھتا رہتا ہے، جس سے اس کا ایمان باللہ دم بدم زیادہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے، اللہ کی الوہیت کا کامل یقین ہو جاتا ہے۔ اس کے ایمان میں مضبوطی، پختگی، جماؤ اور ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ نفس کی بندگی سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے اور اس کے اندر اپنی خودی کا اتنا اچھا تلاعرفان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی پیشانی نہ کسی پتھر کی مورتی کے آگے جھکتی ہے اور نہ کسی قاہرانہ طاقت کے آگے وہ سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ اینٹ چونے کی قبریں، قومی یادگاریں، مقبرے وغیرہ اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو جاتے ہیں وہ تمام اوہام وخرافات سے بالکل کنارہ کش ہو کر صرف اللہ کے اس نظام تشریعی کا متبع بن جاتا ہے جو اس نے اپنے رسول پر اتارا ہے۔

ربوبیت ایمان باللہ کے لیے جس طرح الوہیت کا اقرار و اعتراف ضروری ہے۔ اسی طرح اللہ کی ربوبیت بھی ماننی اور تسلیم کرنی ضروری ہے۔ ربوبیت کا مفہوم بھی اتنا ہی جامع، وسیع اور عام ہے جتنا الوہیت کا مفہوم ہے۔ قرآن اور لغت کے تتبع سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے رب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کائنات اور انسان کی پرورش کرنے والا، ضرورتوں کو بہم پہنچانے والا، ہر چیز کو نشو ونما دینے والا، سب کی کفالت، خبرگیری، دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ وہی پوری کائنات کے لیے ایسی مرکزیت کی شان رکھتا ہے کہ اس پر سب متفرق مجتمع ہو سکتے ہیں۔ وہی ایسا حقیقی اور بے شریک مطاع ہے کہ اس کا حکم ہر ایک پر چلتا ہے حقیقت میں اسی کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ اسی کے لیے فوقیت اور بالادستی ہے، اسی کا سب پر تصرف ہے وہی سب کا آقا، مالک اور مربی ہے۔

دور قدیم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن کے زمانے تک جن جن قوموں کا قرآن نے ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ کی زمین کو اپنے ظلم وعدوان، سرکشی وطغیان، بغاوت وخباثت، تکبر ورعونت، اور شر وفساد سے ناپاک اور نجس کر رہی تھیں، وہ اللہ کے رب ہونے کی کس معنی کے لحاظ سے منکر تھیں؟ کیا وہ اللہ کی پروردگاری کا انکار کر رہی تھیں؟ ایسا نہیں تھا۔ وہ اللہ کی ربوبیت کی قائل تھیں،

البتہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور بہت سے حصے بخرے کر ڈالے تھے۔ وہ اللہ کے رب ہونے کو یوں سمجھتے تھے کہ ایک فوق الفطرت ہستی ہے جس کا کام بس اپنی مخلوقات کو پالنا، پوسنا، ان کی خبرگیری کرتے رہنا، ان کی حاجتوں کو پورا کرنا، اور ان کی نگہبانی و کفالت کرنا ہے۔ یہ سب کچھ ان کے نزدیک اللہ کی ربوبیت کے مفہوم میں داخل تھا اور اس سے ان کو انکار نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ نے اپنی ربوبیت کے ان تمام شعبوں کو سہولت کار کے لحاظ سے بانٹ رکھا ہے۔ فرشتوں، نبیوں، ولیوں، جنوں اور دیوتاؤں، اور اجرام فلکی مثلاً چاند، سورج اور ستاروں کو اس نے اپنی ربوبیت میں حصہ دار مقرر کر دیا ہے وہ اس حیثیت سے شرک کے مرتکب تھے اور انبیاء کرام کی دعوت حق کا محوری نقطہ اسی شرک کا ابطال تھا۔ اللہ کے رب ہونے کا یہ مفہوم کہ وہ خود اپنے اختیار سے امر و نہی کرنے والا ہے۔ تمام اقتدارات کا تنہا مالک ہے، حق و ہدایت کا وہی راہ نما ہے، وہی قانون ساز ہے، وہی اپنے ملک کا حقیقی بادشاہ ہے، اور اپنی مملکت کائنات کا رئیس ہے۔ ان لوگوں کے یہاں مفقود تھا۔ اس اعتبار سے وہ اللہ کو نہیں بلکہ بڑی بڑی انسانی ہستیوں کو رب مانے ہوئے تھے۔ اللہ کو خالق و پروردگار جاننے کے باوجود اور نظری طور پر اس کے قائل ہونے کے باوصف، وہ عملی طور پر تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت، معیشت و سیاست، اجتماع و عمران میں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو ارباب من دون اللہ مان کر ان کی قیادت و سرداری، حاکمیت و بالادستی، قانون سازی و فرماں روائی کے آگے جبہ سائی کرتے اور ان کی طاعت کا دم بھرتے۔

قرآن مجید نے اسی پہلو سے ان کو مشرک قرار دیا اور ان کے غلط عقائد کی تردید کی۔ اور ان کو توحید خالص کی دعوت دی کہ تم لوگ جس طرح اللہ کی الوہیت کا ناتمام اور ناقص اعتراف کرتے ہو اسی طرح تمہارا ربوبیت کا اقرار بھی ناقص اور مشرکانہ ہے۔ اور ان پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ اس بارے میں تمہارا رویہ غلط ہے۔ اور اسی غلطی سے ہزاروں غلطیاں پیدا ہو کر سارے نظام زندگی کو فاسد کر رہی ہیں۔ یہ حقیقت قرآن مجید کی بہت سی آیتوں سے واضح ہو رہی ہے۔ ہم بطور نمونہ چند یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

ایک مقام پر قرآن میں ربوبیت کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے تکوینی نشانیوں کو پیش کر کے بتایا ہے کہ "خلق" اور "امر" دونوں صفتوں سے اللہ تعالیٰ ہی متصف ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (اعراف - ۷)

خبردار ہو جاؤ اسی اللہ کی خلق ہے اور اسی کیلئے امر بھی ہے بڑا بابرکت ہے اللہ جو جہانوں کا رب ہے۔

اسی طرح ایک جگہ یہ بتانے کے بعد کہ تمھیں آسمان و زمین سے جو رزق دے رہا ہے، تمھاری بینائی و شنوائی کا جو مالک ہے، زندہ کو مردہ سے، مردہ کو زندہ سے جو نکالتا ہے، جو ہر معاملہ کی تدبیر کر رہا ہے، وہ اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے، تو اللہ ہی کو تم اپنا رب مانو:

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (یونس)

پس یہی اللہ تمھارا حقیقی رب ہے، اس حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ آخر تم کہاں بھٹکائے جا رہے ہو۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہو رہا ہے کہ آسمان، زمین، رات، دن، چاند، سورج سب اپنا اپنا مقرر وظیفہ ادا کیے جا رہے ہیں، یہ سب کچھ جسکی قدرت کا کرشمہ ہے وہی رب ہے۔ اور اسی کے لیے بادشاہی ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (زمر - ۱)

یہی اللہ تمھارا رب ہے، ملک اسی کا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، آخر تم لوگ کہاں پھیرے جا رہے ہو۔

ایک اور موقع پر، خاص طور پر، اہل کتاب کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران - ۷)

کہو، اے اہل کتاب اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے تمھارے درمیان یکساں مسلم ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو، اللہ کو چھوڑ کر، رب بنائے

ایک جگہ اہل کتاب کی شکایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ - ۵)

ان لوگوں نے اللہ کے سوا اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا لیا ہے۔

اس آیت کریمہ کو سن کر حضرت عدی ابن حاتم جو پہلے عیسائی تھے اور پھر مسلمان ہو چکے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں عرض کیا کہ ہم لوگوں نے احبار و رہبان کو رب تو نہیں بنا لیا تھا کہ ان کو پیدا

کرنے والا اور پالنے والا سمجھ لیا ہو۔ حضور نے فرمایا کیا ایسا نہیں تھا کہ تم لوگوں نے ان کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور ان کے حرام کیے ہوئے کو حرام قرار دے رکھا تھا؟ عدی نے کہا، ہاں یہ تو ضرور ہوا۔ آپ نے فرمایا یہی ان کو رب بنا لینا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ربوبیت کے مفہوم میں تکوینی اور تشریعی دونوں پہلو داخل ہیں اور حاکمیت، سلطانی فرماں روائی اور قانون سازی سب پر یہ لفظ مشتمل ہے۔

مالکیت جس طرح اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کا ماننا ایمان باللہ کے لوازم میں سے ہے اسی طرح اس کی مالکیت و بادشاہی کا ماننا بھی ضروری ہے۔ گو یہ مفہوم و مدعا دونوں مذکورہ بالا صفتوں میں بھی پورا موجود ہے تاہم مستقل طور پر ایک اور صفت مالک کی بھی ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآن مجید نے اللہ کے لیے اس صفت کو بہت تاکید کے ساتھ ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب ساری کائنات اسی کی مخلوق و مربوب ہے تو اسی کی رعیت اور مملوک بھی ہے۔ سارا ملک جب اسی کا ہے تو پھر کسی غیر کی بادشاہی اس کے ملک میں کیسے چل سکتی ہے جو لوگ اس کے مدعی بنے بیٹھے ہیں وہ ناجائز مالک بلکہ غاصب ہیں۔ اللہ کی زمین اور اس کے بندوں پر اس کی بادشاہت کے سوا کسی اور کی بادشاہت کا تسلط نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں ہے بلکہ فساد اور تباہی اور ہلاکت و بربادی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ جب تک نظام دنیا اللہ کے بھیجے ہوئے اور نبیوں کے لائے ہوئے فطری قوانین کے تحت نہ ہو، ہر مومن کے ایمان باللہ کا تقاضا ہے کہ وہ چین سے نہ بیٹھے اور خدا کی زمین میں خدا کے قانون کو جاری و نافذ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس بارے میں قرآن حکیم نے نہایت صفائی کے ساتھ ہمیں وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو ہمیں جاننا چاہیے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں اہل حق کی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس کے ذرائع اور وسائل کی تعیین میں کچھ جزئی اختلاف ہو سکتے ہیں جن کی چنداں اہمیت نہیں لیکن اصل مدعا میں کسی اختلاف کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ یہاں ہم چند آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں اللہ کی بادشاہی کا غیر منقسم ہو جانا واضح کر دیا گیا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ	کہو اے اللہ تو ملک کا مالک ہے (اپنے اصول تکوینی
مَنْ تَشَاۤءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۤءُ	و تشریعی کے تحت) جس کو چاہتا ہے ملک بخش دیتا ہے اور
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۤءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۤءُ بِيَدِكَ	جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے

الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران)

عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی قبضہ میں ساری بھلائی ہے یقیناً تو ہی ہر چیز پر (تکوینی و تشریعی ہر حیثیت سے) قدرت رکھنے والا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر)

یہی اللہ (جس کی قدرت کی تکوینی نشانیاں تم نے دیکھ لیں) تمارا رب ہے، اسی کے لیے سارا ملک ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (اسراء - ۱۲)

اور کہو کہ ساری تعریف تو اس اللہ ہی کے لیے ہے جس کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اور نہ کوئی اس کے ساتھ ملک میں شریک ہے اور نہ اس کے لیے کوئی کمزوری کی وجہ سے اس کا کارساز ہے، اور اس کی خوب کبریائی بیان کرتے رہو

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (مومن - ۲)

پس حکم اللہ ہی کے لیے ہے جو برتر ہے اور کبریائی رکھتا ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا (کہف - ۴)

اور اللہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

ایمان باللہ کے لیے ہر حال میں اس کی توحید ذات اور توحید صفات دونوں کا ماننا ضروری ہے۔ تین مذکورہ صفتوں کے علاوہ بھی بہت سی صفات الٰہی ہیں مثلاً علم، ارادہ، احاطہ، حیات بخشنا، موت دینا، قدرت، سمع، بصر وغیرہ لیکن اگر غور کیا جائے تو تمام صفات کا مرجع صرف یہی تین یعنی الوہیت، ربوبیت، اور مالکیت ہیں باقی سب انہی کے توابع ہیں۔

گویا اللہ کو ماننے کا خلاصہ یہ ہوا کہ ایک ہی ہستی ہے جو الٰہ ہونے، رب ہونے، اور بادشاہ حقیقی ہونے کے لائق ہے اور سارا کارخانۂ کائنات اسی پر قائم ہے۔ وہ ایسا فرماں روا ہے جس کو ذرہ ذرہ کا علم اجمالی و تفصیلی حاصل ہے۔ ساری چیزوں کو دیکھتا ہے، سب کی سن لیتا ہے، اس کی قدرت کے احاطہ سے کوئی شے بھی خارج نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسا خبیر و بصیر ہے کہ اس کے انتقام سے بھاگ کر کہیں بھی کوئی پناہ نہیں حاصل کی جا سکتی۔ یہی وہ تصور صفات باری ہے جس پر انسانیت کی تعمیر انبیاء نے کی ہے اور اسی کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

غور تو کیجیے کہ کتنا مبارک ہوگا وہ نظام زندگی جس کی تعمیر اس تصور پر کی گئی ہو کہ یہ کائنات اور انسان

بے خدا نہیں ہے بلکہ ایک مقتدر اعلیٰ ہے جو پیدا کرنے اور پالنے کے ساتھ ساتھ اپنی بادشاہی بھی چلا رہا ہے، اس نے اپنی رعیت انسان کو، ظاہر و باطن میں، سرو سامان زیست اور بے شمار طاقتیں دے کر، اور اپنی مرضیات اپنے نبیوں کے توسط سے، آگاہ کر کے واضح کر دیا ہے کہ تم کو میرے سامنے جلد ہی کے لیے آنا ہوگا اور اس وقت نہ تو بغیر اسکی اجازت کے کسی کی سفارش چلے گی اور نہ کوئی کفارہ بن کر کسی کے گناہوں کو بخشوا سکتا ہے۔ ہر انسان صرف اپنے ایمان اور عمل کا بدلہ پائے گا۔ اللہ رحیم و رحمان ہے، اس کو نیکی پسند ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کی قانون رحمت کے تحت ایک دوسرے پر رحم کریں۔ وہ غفور ہے اور چاہتا ہے کہ انسانوں کا آپس میں رویۂ زندگی اتنا صحیح ہو کہ وہ ایک کنبہ بن کر رہیں، اسی کے حکم پر چلیں اور ایک دوسرے کی لغزشوں، خطاؤں پر بے جا گرفت کرنے کے بجائے عفو و درگذر سے کام لیں۔ وہ عادل ہے اور اپنے بندوں میں عدل و قسط کے قیام و بقا کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ منعم ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح اس نے لوگوں پر انعام کیا ہے لوگ دوسروں پر انعام کریں۔ وہ محسن ہے اور احسان اور شکر گذاری کو محبوب رکھتا ہے۔ وہ منصف ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے سے ڈرے اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم و خبیر ہے، دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں اور سارے پوشیدہ بھیدوں کو جانتا ہے اس وجہ سے انسان اپنی ظاہری ایمانداری اور بناوٹی تقویٰ شعاری سے اس کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ وہ محیط ہے اس کے قانون کی خلاف ورزی کر کے کوئی مجرم و عاصی اس کی پکڑ سے بھاگ نہیں جا سکتا۔

ایمان باللہ کے اس نقشہ پر جن افراد کی تربیت ہوگی ان سے جو مضبوط اور بلند سیرت گروہ منظم ہوگا وہ انسانیت کے لیے سراپا خیر و برکت ہوگا اور اس کی سعی سے دنیا میں جو نظام اجتماعی برپا ہوگا وہ امن عالم کا ضامن اور کفیل ہوگا۔ ان تصورات کے رکھنے والے مومنین کے آگے کبھی مجرد دنیوی اور مادی حکومت نہیں ہو سکتی بلکہ پوری انسانی زندگی میں وہ انقلاب چاہیں گے جو اللہ کے رسولوں کے ذریعہ سے برپا ہوا۔ جس کے لیے اللہ نے ہمیشہ اپنے نبیوں کو بھیجا، کتابیں اتاریں اور آخر میں اس سلسلہ کو قرآن اور حامل قرآن پر ختم کیا۔ اور امت مسلمہ کے لیے بحیثیت ایک بامقصد جماعت کے یہی نصب العین مقرر کیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم "حکومت الٰہیہ" یا "اقامت دین" یا "اتباع شریعت" کے لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں یہ ایمان باللہ کے لوازم میں سے ہے، اگر اس کو چھوڑ

دیا جائے تو پھر "ایمان باللہ" کی روح غائب ہو جاتی ہے۔

نتائج و ثمرات اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں صاف، سیدھے اور فطری طریقہ پر جو کچھ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اس کو ہم نے پیش کر دیا ہے۔ باقی رہیں صفات الٰہیہ پر متکلموں اور متصوفوں کی وہ تمام بحثیں اور تحقیقات جو مشائین اور اشراقیین کی تقلید و پیروی میں پیدا ہوئی ہیں اور جن میں علماء کا ایک گروہ برابر مبتلا چلا آ رہا ہے، اس کو ہم نے قصداً بحث سے خارج کر دیا ہے۔ اقامت دین، اتباع شریعت اور دعوت دینی کے لیے ان کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صرف اس چیز کی ضرورت ہے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ کہا ہے اس کو عام فہم انداز میں لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ ہمارے خیال میں سلیم الفطرت انسانوں کے دل و دماغ کے لیے اس سے زیادہ لذیذ اور زود ہضم غذا کوئی اور نہیں۔

ایمان باللہ جب اپنے کامل و مکمل اور جامع و بسیط مفہوم و مدعا کے ساتھ انسان کے ذہن و خارج اور ظاہر و باطن پر چھا جاتا ہے تو اس کے اثرات و نتائج صریح طور پر محسوس ہونے لگتے ہیں، اور ایک مومن کی زندگی، ایک غیر مومن کی زندگی سے ہر حیثیت سے ممتاز نظر آنے لگتی ہے۔ اس کا رویہ اس کے ایمان کا پتہ دیتا ہے۔ وہ مجسم دعوت ایمانی بن جاتا ہے۔ وہ جہاں رہتا ہے خودی، خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ رہتا ہے اور اپنے ماحول پر اپنے استقلال فکر اور استقلال عمل کا اثر چھوڑتا ہے۔ وہ اپنے "خلیفۃ اللہ" ہونے کی حیثیت کو محسوس کر کے اصل مالک کی کبریائی و جبروت کے آگے خشوع و خضوع، عاجزی و انکساری، تواضع و فروتنی اختیار کرتا ہے، اور زندگی کے تمام نشیب و فراز میں صبر و توکل کے ساتھ شجاعانہ اقدام از بہادرانہ طرز عمل کا بہترین مظاہرہ کرتا ہے۔ استغنا، قناعت اور بے نیازی سے دنیا اور اہل دنیا کے درمیان رہتے ہوئے اپنے عقائد و خیالات، اعمال و اخلاق، صفات و عادات میں اللہ کی صفات کا مظہر اور "تخلق باخلاق اللہ" کا جیتا جاگتا چلتا پھرتا نمونہ ہوتا ہے۔

(باقی)

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(۳)

(مترجمہ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی)

اہل الرائے ان لوگوں کے مقابلہ میں (جن کا ذکر اوپر گذرا اور جن کو اہل الحدیث کہا جاتا ہے) ایک دوسرا گروہ ہے جس کا تعلق امام مالک اور سفیان ثوری کے عہد، اور اس کے بعد کے زمانوں سے ہے۔ یہ لوگ نہ (فرضی) مسائل پر سوال وجواب کو برا سمجھتے تھے نہ فتوی دینے میں کوئی ڈر (اور جھجکاہٹ) محسوس کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ فقہ ہی پر دین کی بنیاد ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کو وسیع پیمانہ پر لوگوں تک پہنچایا جائے۔ لیکن حدیثیں بیان کرنے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے سے بہت ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ امام شعبی نے صاف اور صریح لفظوں میں فرمایا:

"کسی حدیث کا (بجائے رسولؐ اللہ کے) صحابہؓ تک پہنچ کر رہ جانا ہمیں زیادہ پسند ہے، تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو وہ دوسروں ہی کی طرف منسوب ہو کر رہ جائے (اور ذات نبوی کی طرف اس کی نسبت کے گناہ سے انسان بچ جائے)"

ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ:

"مجھ کو (احادیث رسولؐ سنانے کے بجائے) یہ کہنا زیادہ پسند ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نے یہ فرمایا ہے، علقمہ نے یہ کہا ہے۔"

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ جب رسول اللہ صلعم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان کا چہرہ (روایت حدیث کی بھاری ذمہ داریوں کی ہیبت سے) متغیر ہو جاتا اور (سہم سہم کر) فرماتے:

(رسول اکرم صلعم نے) ایسا ہی (فرمایا ہے) یا اسی کے قریب قریب۔ ایسا ہی (فرمایا) یا اسی کے قریب قریب۔"

حضرت عمرؓ نے جب انصار کا ایک وفد کوفہ بھیجا تو انھیں ہدایت کی کہ:

"تم کوفہ جا رہے ہو، جہاں تم ایسے (بخدا) لوگوں سے ملوگے جو قرآن پڑھ کر روتے ہیں، یہ لوگ تمھارے پاس آکر کہیں گے کہ محمد (رسول اللہ صلعم) کے ساتھی آئے! محمدؐ کے ساتھی آئے! غرض وہ تمھارے پاس آکر تم سے حدیثیں سننا چاہیں گے تو تم حتی الوسع کم سے کم حدیثیں بیان کرنا۔"

ابن عون فرماتے ہیں کہ جب امام شعبی کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو وہ اس کا جواب دینے سے پہلو تہی کرتے۔ ان کے بالمقابل ابراہیم نخعی کا دستور یہ تھا کہ سائل کا جواب دینے میں ان کی زبان خاموش ہونا جانتی ہی نہ تھی ـــ ان تمام آثار کو امام دارمی نے نقل کیا ہے۔

طلوع تخریج کے اسباب (اس اختلاف نظر کی وجہ سے) حدیث اور فقہ اور مسائل کی تدوین، (جو پہلے لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا چکی تھی) ان لوگوں کے جس طرح کام آئی اس کی نوعیت علمائے حدیث کے طریق استفادہ سے جداگانہ تھی، جس کی وجہ اور جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے پاس احادیث و آثار کا وہ ذخیرہ عظیم نہ تھا جس کے ذریعہ اہل الحدیث کے اختیار کیے ہوئے اصول پر مسائل فقہیہ کا استنباط کر سکتے۔ نیز یہ کہ ان کے سینے اس بات کے لیے کھل نہ سکے تھے کہ (مختلف الخیال) علمائے سلف کے اقوال کو گہری نگاہ سے دیکھتے، ان کو جمع کرتے، ان پر بحث کرتے (بلکہ اس کے برعکس) انھوں نے اس بارے میں وہ طریقہ اختیار کیا جس سے اتہامات کا ہدف بن گئے اور (تمام اہل علم کو ان کے اپنے صحیح موقف پر رکھ کر ان کے اقوال پر غیر جانبدارانہ نظر تحقیق و تنقید ڈالنے کے بجائے) انھوں نے صرف اپنے ائمہ کو لے لیا اور ان کے متعلق دلوں میں یہ نقش عقیدت بٹھا لیا کہ انھیں تحقیق کا بلند ترین مقام حاصل تھا (مختصر یہ کہ) ان لوگوں کے دل اپنے شیوخ کی طرف انتہائی حد تک جھک گئے تھے، چنانچہ علقمہ نے کھلے بندوں فرمایا:

"کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ پختہ نظر رکھتا ہے۔"

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ:

"ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحبت رسول کی فضیلت کا سوال نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ (تابعی) ابن عمر (صحابی) سے بڑے فقیہ ہیں۔"

(پھر تیسری چیز یہ کہ) ان لوگوں کو قدرت کی طرف سے ایسی ذہانت اور زود فہمی عطا ہوئی تھی اور ان کا ذہن ایک بات سے دوسری بات کی طرف بسرعت منتقل ہونے کا اتنا ملکہ رکھتا تھا کہ وہ اپنے شیوخ کے اقوال پر جواب مسئلہ کی بآسانی "تخریج" کر سکتے تھے ۔۔۔ اور حق یہ ہے کہ جس کام کے لیے جو پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے اسی کام کی راہ آسان بھی کی جاتی ہے، اور ہر گروہ اپنے ہی سرمایۂ فکر و نظر میں مگن رہتا ہے ۔۔۔ الغرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان حضرات نے تخریج کو اپنی فقہ کی عمارت کا سنگ بنیاد قرار دے لیا۔

تخریج کا قاعدہ

تخریج کا قاعدہ یہ ہے کہ آدمی اس صاحب علم کی کتاب اپنے حافظہ میں منتقل کرلے جو اس کے شیوخ و اساتذہ کی بہترین وکالت کرتا ہو اور علمائے جماعت کے اقوال سے سب سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو اور (مختلف اقوال میں سے ایک کو دوسرے پر) ترجیح دینے میں سب سے بڑھکر فکر صائب رکھنے والا ہو۔ پھر (اس طرح کی کتاب حفظ کر لینے کے بعد) ہر مسئلہ میں حکم کی علت پر غور کرے، اور جب کوئی بات اس سے پوچھی جائے، یا خود ہی کو کسی امر میں حکم شریعت معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اپنے شیوخ کی تصریحات کے اس ذخیرہ پر جس کو اس نے اپنے حافظہ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ نگاہ ڈالے، اگر اس سے مسئلہ کا جواب صریح طور پہ مل جائے تو خیر، ورنہ شیوخ کے ان اقوال صریحہ کے عموم کو دیکھے اور اس عموم کو اس مسئلہ پیش آمدہ پر پھیلا دے یا ان کے کسی قول کے کسی ضمنی اشارہ کو ٹٹولے اور اس سے مسئلہ کا جواب مستنبط کرے، چنانچہ بعض اوقات ایک کلام اپنے اندر ایسا اشارہ یا اقتضاء رکھتا ہے جس سے مسئلہ زیر غور کی گرہ کھل جاتی ہے، اور کبھی مسئلہ مصرحہ (جس کی تصریح اپنے شیوخ کے اقوال میں ہوتی ہے) کی ایک شے نظیر ہوتی ہے، اس لیے اس کو اس پر محمول کر دیا جاتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی، (جو اقوال شیوخ میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوتا بلکہ) جس کی تصریح تخریج یا سبر[1] یا حذف سے ہو چکی ہوتی ہے، علت کا سراغ لگاتے ہیں اور (اشتراک علت کو دیکھتے ہوئے) اُس مسئلہ پر بھی وہی حکم لگا دیتے ہیں جس کی تصریح (ابھی تک کے مجموعۂ اقوال و فتاوی میں نہیں)

[1] "سبر" "تخریج" کی طرح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل کے تمام اوصاف کو اس فرع کے سامنے جس کو اصل پر قیاس کیا جا رہا ہے، رکھ کر دیکھا جائے اور اس وصف کو لے کر جو اصل اور فرع میں مشترک طور پر موجود ہے، باقی سے صرف نظر کر لیا جائے تاکہ حکم کی علت متعین ہو جائے۔ (مترجم)

موجود نہیں ہوتی۔ بعض اوقات اس مسئلہ مصرحہ کے متعلق اس طرح کی دو تقریریں ہوتی ہیں کہ اگر دونوں قیاس[1] اقترانی یا قیاس شرطی[2] کے طور پر ایک مرکز پہ جمع ہو جائیں تو اس سے جو نتیجہ برآمد ہو، وہی اس مسئلہ کا جواب ہو جائے۔ پھر کبھی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک بات شیوخ کے فرمودات میں، مثال اور تصنیف تقسیم کے اعتبار سے تو بالکل بے نقاب ہوتی ہے مگر بلحاظ تعریف ـــ ایسی تعریف جو جامع بھی ہو اور مانع بھی ـــ وہ نامعلوم اور غیر متعین ہوتی ہے، تو اس شکل میں وہ اہل زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پوری کاوش سے اس امر کی ذاتیات[3] معلوم کرتے ہیں، اس کی جامع اور مانع تعریف معین کرتے ہیں، اس کے مبہم حصوں کو واضح طور پر متعین اور اس کے مشابہ پہلوؤں کو ممیز کرتے ہیں۔ کبھی شیوخ کا کوئی قول دو صورتوں کا احتمال رکھتا ہے تو یہ اہل تخریج غور کرکے ایک صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ کبھی مسائل اور ان کے دلائل میں جو تعلق ہوتا ہے، اس پر پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنی انگشت بحث و فکر سے اس پردہ کو ہٹا دیتے ہیں۔ بعض اہل تخریج نے اپنے ائمہ کے (اقوال و تصریحات کے بجائے ان کے) کسی کام کے کرنے، یا کسی کام پر سکوت اختیار کرنے سے بھی استدلال کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مجتہد فی المذہب

غرض یہ ہیں استنباط مسائل کے وہ طریقے جن کو تخریج کہا جاتا ہے، اور جو مسئلہ اس طرح مستنبط کیا جاتا ہے اس کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ "فلاں شخص کا تخریج کیا ہوا مسئلہ یہ ہے"۔ یا اس طرح کہ "فلاں امام کے مذہب پر، یا فلاں کی قائم کردہ بنیاد کے لحاظ سے، یا فلاں کے قول کے مطابق مسئلہ کا جواب یہ ہے"۔ اور وہ لوگ (جو یہ تخریج کرتے ہیں) مجتہد فی المذہب کہے جاتے ہیں۔ اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ "جس نے مبسوط یاد کرلی وہ مجتہد ہے"۔ یعنی اگرچہ وہ علم روایت سے بالکل بے بہرہ ہی کیوں نہ ہو اور ایک حدیث بھی نہ جانتا ہو ـــ تو اس قول سے اس کی مراد دراصل اس (اجتہاد) سے ہے جس کی بنیاد اسی

---

[1] قیاس اقترانی علم منطق کی اصطلاح میں اس قیاس کو کہتے ہیں جس کے مقدمات کے بیان کے بعد ان مقدمات کا نفس نتیجہ یا اس کا نقیض مذکور ہو۔ [2] "قیاس شرطی" قیاس اقترانی ہی کی ایک مخصوص قسم ہے، جس کے دونوں مقدمے شرطی ہوں۔ مقدمہ شرطی سے مراد وہ مقدمہ ہے جس میں کسی چیز کے لیے کسی دوسری چیز کے ثبوت یا اس کی نفی کا حکم نہ لگایا گیا ہو۔

[3] "ذاتیات" سے مراد کسی امر کے وہ اوصاف ہیں جو اس کی حقیقت اور جوہریت سے تعلق رکھتے ہوں۔ (مترجم)

قاعدۂ تخریج پر ہو۔

بعض مذاہب کے پھیلنے اور بعض کے مٹنے کے اسباب

یہ تخریج ہر مذہب میں ہوئی اور پورے زور شور سے ہوئی۔ لیکن پھر ہوا یہ کہ جس مذہب کے اہل علم شہرت عام کے مالک تھے، قدرتاً قضا اور افتا کے مناصب انہی کو سپرد کردیے گئے، جس کی وجہ سے ان کی تصنیفات عوام الناس میں مشہور ہوگئیں اور ہر طرف لوگ ان کو پڑھنے پڑھانے لگے۔ اس طرح وہ مذہب اطراف عالم میں پھیل نکلا اور برابر پھیلتا رہا۔ اس کے برعکس جس مذہب کے علمبردار گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے، اور نہ ان کے ہاتھوں میں قضا و افتا کے عہدے آئے، نہ عام لوگوں نے ان سے کسی گہری وابستگی کا اظہار کیا، وہ مذہب چند ہی دنوں بعد صفحۂ ہستی سے نابید ہوگیا۔

مسلک حق و راہ اعتدال

جاننا چاہیے کہ مذکورہ بالا دونوں طریق استنباط ـــ طریق تخریج اور طریق تتبع احادیث ـــ میں سے ہر طریقہ اپنے لیے ایک مضبوط دینی بنیاد رکھتا ہے۔ اور علمائے محققین ہر زمانہ میں بیک وقت ان دونوں طریقوں کو اختیار کرتے رہے ہیں (فرق صرف تناسب میں ہوتا تھا یعنی) بعض نے طریق تخریج سے زیادہ کام لیا اور الفاظ حدیث کے اتباع کا کم لحاظ کیا، اور بعض کا رجحان اتباع روایات کی طرف زیادہ اور طریق تخریج کی طرف کم رہا۔ پس یہ مناسب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک طریقہ کو بالکلیہ چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ (بدقسمتی سے اہل الحدیث اور اہل فقہ) دونوں جماعتوں کے عام لوگوں کا شیوہ ہے۔ حق خالص یہ ہے کہ (ان دونوں طریقوں کو جمع کیا جائے) ان میں باہم مطابقت پیدا کی جائے اور ایک کے اندر جو نقص ہے، دوسرے کی مدد سے اس کی تلافی کی جائے۔ یہی مدعا ہے حضرت حسن بصری کے اس ارشاد کا کہ :

> "اس خدا کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمہارا راستہ غالی (حد سے تجاوز کرنے والے) اور جافی (حد واجب تک پہنچنے میں کوتاہی کرنے والے) دونوں کے درمیان ہونا چاہیے"۔

پس، جو اہل حدیث ہیں، ان کو چاہیے کہ اپنے اختیار کیے ہوئے مسائل اور مذاہب کو عہد تابعین اور اس کے بعد کے ائمہ مجتہدین کی رایوں پر پیش کریں، اور جو اہل تخریج ہیں ان کو احادیث کے ذخیرہ سے فکر و نظر کا وہ لگاؤ پیدا کرنا چاہیے جس کے ذریعہ وہ کسی صریح اور ثابت شدہ (حدیث) کی مخالفت سے بچ سکیں،

اور کسی ایسے مسئلہ میں جس کے متعلق کوئی حدیث یا اثر موجود ہو، اپنی رائے لگانے سے حتی الوسع احتراز کرسکیں۔

اہل الحدیث کی افراط کسی محدث کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ان اصول و قواعد کے استعمال میں، جن کو ائمہ حدیث نے پورے اطمینان کے ساتھ وضع کیا ہے لیکن بہرحال ان کی قطعیت پر شارع کی کوئی نص موجود نہیں ہے، اتنا غلو اور تشدد کرے کہ اس سے کسی حدیث کو (جو ان قواعد پر پوری نہ اترتی ہو) یا کسی قیاس صحیح کو ٹھکرا بیٹھے۔ مثلاً ہر اس حدیث کا انکار کر دینا جس کے مرسل یا منقطع ہونے کا معمولی شبہہ بھی موجود ہو، جس طرح کہ علامہ ابن حزم نے کیا ہے کہ امام بخاری کی روایت کی ہوئی "تحریم معازف" (گانے بجانے کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو صرف اس بنا پر رد کر دیا کہ اس کی سند میں انقطاع کا شبہہ موجود ہے، حالانکہ یہ حدیث فی الواقع متصل اور صحیح ہے (اس لیے ایک ایسے شبہہ کو جس کی واقعیت پر کوئی ثبوت موجود نہیں، تنی اہمیت دینا کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا کہ حدیث کو بالکل ناقابل قبول ٹھیرا دیا جائے) اس قسم کے شکوک کو صرف اسی وقت درخور اعتنا سمجھا جانا چاہیے جب کوئی دوسری صحیح حدیث اس کے مخالف پڑتی ہو۔

یا مثلاً محدثین کا یہ کہنا کہ "فلاں راوی فلاں شخص کی روایات کا سب سے بڑا حافظ ہے" (اس بات کا ان کے طرز فکر و عمل پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ اس راوی کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو دوسروں کی بیان کردہ حدیثوں پر لازماً ترجیح دے دیا کرتے ہیں، اگرچہ دوسرے راویوں میں (دیگر اعتبارات سے) ترجیح کے ہزاروں وجوہ پائے جاتے ہوں اور جب کہ (یہ بات بھی معلوم و مسلم ہے کہ) روایت[۱] بالمعنی کرتے وقت عام راویان حدیث کی نگاہیں معانی پر مرکوز رہا کرتی تھیں نہ کہ ادب و زبان کے ان نکتوں پر، جو صرف بال کی کھال نکالنے والے عربی دانوں کے جاننے پہچاننے کی چیزیں ہیں تو "ف" "یا" "و" وغیرہ حروف سے، یا کسی لفظ کی تقدیم و تاخیر سے استدلال کا رخ متعین کرنا، اور اسی طرح کی اور باتیں ان کے تکلف بے جا اور تشدد ناروا کی آئینہ دار ہیں (جن کو اصل مقصد روایت سے کوئی تعلق نہیں) ورنہ تم دیکھتے ہو کہ عموماً جب کوئی دوسرا راوی

[۱] "روایت بالمعنی" کا مطلب یہ ہے کہ ارشادات رسول کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کے اصل مقصود کو اپنے لفظوں میں ادا کر دیا جائے۔ اکثر و بیشتر راویوں کا طریقۂ روایت یہی تھا۔ (مترجم)

اسی روایت کو بیان کرتا ہے تو اس حرف کو چھوڑ کر (جس کو راوی اول نے استعمال کیا تھا) اس کی جگہ کوئی دوسرا حرف لاتا ہے۔ پس اس باب میں قول فیصل یہ ہے کہ راوی جو کچھ بیان کرتا ہے، اس کے متعلق بظاہر یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے۔ ہاں اگر کوئی دوسری حدیث یا کوئی اور دلیل (اس کے خلاف) منظر عام پر آجائے تو ضروری ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی طرف رجوع کر لیا جائے۔

اہل الرائے کی تفریط اسی طرح اہل تخریج کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ (کرید کرید کر) کسی ایسے قول کی تخریج کریں جو ان کے ائمہ اور شیوخ کے کلام کی روح اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو اور اہل زبان و علمائے لغت کا عام اسلوب سخن فہمی اس قول کو اس کلام کا نتیجہ قرار دینے سے انکار کر رہا ہو، اور اس قول کی بنیاد (اصل اور فرع کی) جس علت مشترک کی تخریج پر رکھی گئی ہو، یا اس کو جس مسئلہ کی نظیر مان کر اس پر محمول کیا گیا ہو (وہ متفق علیہ نہ ہوں بلکہ ان کے علت مشترک ہونے یا نظیر مسئلہ ہونے میں) ارباب نظر اختلاف رکھتے ہوں اور ان کے بارے میں ایک سے زائد رائیں پائی جاتی ہوں، پھر (اس تخریج کی صحت کے غیر یقینی ہونے کی حد یہ ہو کہ) اگر بالفرض خود ان ائمہ مذہب سے (جن کے اقوال کو سامنے رکھ کر یہ تخریج کی گئی ہے) یہی مسئلہ پوچھا جاتا تو شاید وہ بھی کسی امر مانع کی وجہ سے اس معاملہ کو اس مسئلہ کی نظیر قرار دے کر اس پر محمول نہ کرتے۔ یا اپنے قول کی کوئی ایسی علت بتاتے جو ان حضرات کی معین کی ہوئی اور نکالی ہوئی علت کے ماسوا ہوتی۔ تخریج تو جائز صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ در اصل مجتہد کی تقلید کا دوسرا نام ہے، اس لیے وہ نقص سے پاک اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ کلام مجتہد کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کی گئی ہو۔

اسی طرح ان لوگوں کے لیے یہ بات بھی اچھی نہیں کہ صرف ایک ایسے اصول کی پیروی میں (جو اپنی قطعیت پر کوئی نص نہیں رکھتا اور) جس کو خود انھوں نے، یا ان کے شیوخ نے اپنی فہم سے مقرر کر رکھا ہے۔ کسی ایسی حدیث یا اثر کو رد کر دیں جس کو تمام علمائے حدیث صحیح کہتے اور مانتے آئے ہوں۔ جیسا کہ بعض حضرات نے (اپنے قیاس اور اپنے اصول کی پیروی میں) حدیث "مصراۃ"[1] کو ٹھکرا دیا، یا جس طرح اموال غنیمت

---

[1] "مصراۃ" اس دودھ والے جانور کو کہتے ہیں جس کو بیچنا مقصود ہو اور اس کے تھن سے چند اوقات اس لیے دودھ نہ نکالا گیا ہو کہ خریدار اس کے تھن کی بڑائی دیکھ کر دھوکے میں پڑ جائے۔
(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۳ پر)

میں قرابت داران رسول[۱۵] کے حصہ کو ساقط کر دیا۔ یہ اس لیے کہ ایک خود ساختہ اصول کے مقابلہ میں حدیث رسول کا پاس بہر صورت زیادہ ضروری ہے۔ یہی وہ راز حقیقت ہے جس کی طرف امام شافعی کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں

"میں نے جو رائے بھی دی ہو یا جو اصول بھی مقرر کیا ہو (حدیث رسول کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں) اگر رسول اللہ صلعم کا کوئی ارشاد اس کے خلاف مل جائے تو لینے کے قابل وہی بات ہے جو رسول کی طرف سے ملی ہو۔"

(اہل الحدیث اور اہل تخریج کی افراط و تفریط کے بارے میں) ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، قریب قریب بالکل وہی حقیقت ان الفاظ سے بھی ٹپک رہی ہے جو امام ابوسلیمان خطابی نے اپنی کتاب "معالم السنن" کے آغاز بحث میں تحریر کیے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں ارباب علم دو گروہ ہوگئے اور دو پارٹیوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک گروہ تو اہل حدیث و اثر حضرات کا ہے اور دوسرا اہل فقہ و نظر کا۔ ان کا حال یہ ہے کہ (دو مخالف کیمپ ہونے کے باوجود) یہ دونوں ایک دوسرے کے برابر کے محتاج ہیں اور اپنا مقصود واقعی حاصل کرنے میں ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنے مد مقابل گروہ سے بے نیاز نہیں، کیونکہ حدیث کی حیثیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳) حدیث مصراۃ کا مفہوم یہ ہے کہ "جو شخص ایسا جانور خریدے، اس کو دودھ نے اور حقیقت حال سے واقفیت ہو جانے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے جانور کو رکھے یا واپس کر دے، اگر واپس کرے تو نکالے ہوئے دودھ کے عوض اس کے مالک کو ایک صاع خرما دیدے"

بعض فقہا نے اس حدیث پر عمل کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی یعنی وہ خلاف قیاس ہے، قیاس تو یہ کہتا ہے کہ نکالے ہوئے دودھ کا ضمان (بدل) اس کے برابر ہونا چاہیے لیکن اس حدیث کا کہنا یہ ہے کہ چاہے دودھ کتنا ہی نکالا ہو، ایک سیر نکالا ہو یا دس میں سیر بہر حال اس کا ضمان ایک ہی صاع خرما ادا کرنا چاہیے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا[۱۵]) "قرابت داران رسول" سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو فتح خیبر کے بعد کل مال غنیمت کا پچیسواں حصہ دیا تھا۔ لیکن خلفاء راشدین کے زمانہ میں اس پر عمل نہ ہونے کے باعث بعض فقہا نے ان لوگوں کے اس حصہ کو تسلیم نہیں کیا۔

(مترجم)

بنیاد کی سی ہے جس کو اصل کہنا چاہیے، اور فقہ کی حیثیت عمارت کی سی ہے، جو اصل کے لیے فرع کا مقام رکھتی ہے، اور سبھی (جانتے ہیں کہ) جو عمارت کسی بنیاد کے اوپر نہ اٹھائی گئی ہو وہ کبھی ٹھیر نہیں سکتی اسی طرح ہر وہ بنیاد، جس کے اوپر کوئی عمارت نہ ہو، ایک چٹیل میدان اور اجڑے ہوئے کھنڈر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگرچہ ان دونوں فرقوں میں، اپنے مقام و محل کے اعتبار سے، چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ہر ایک دوسرے کی (اعانت کی) عمومی احتیاج رکھتا ہے، اور کسی لمحہ بھی کوئی گروہ دوسرے کی محتاجی سے مستغنی نہیں ہو سکتا، مگر (ان تمام باتوں کے باوجود) میں ان کو (ایسا غلط کار) پاتا ہوں کہ وہ باہم کھنچے ہوئے ہیں، حالانکہ راہ حق میں تعاون ان پر لازم ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی نہیں کرتے۔ ان میں سے جو طبقہ "اہل حدیث" کہلاتا ہے اس کے سواد اعظم کی معراج سعی و عمل صرف یہ ہے کہ روایتوں کو بیان کرے، سندوں کو جمع کرے اور ان غریب و شاذ حدیثوں کو جن کی عبارتوں کا بڑا حصہ موضوع یا مقلوب[۵] ہے، تلاش کرتا رہے۔ یہ لوگ (سند کے ایسے پجاری ہوتے ہیں کہ) نہ تو متن احادیث کا کوئی لحاظ کرتے ہیں، نہ اپنی نگاہ کو مدعائے حدیث سے آشنا کرتے، نہ اس کے اسرار کا سراغ لگاتے، نہ ان کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈھ نکالنے کی سعی کرتے۔ بسا اوقات فقہاء پر عیب لگانے اور انھیں مطعون کرنے اور ان پر سنت رسول کی مخالفت کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے، حالانکہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ فقہا کو علم و فہم شریعت کی جو دولت بخشی گئی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں آئی ہے، اور ان کے خلاف اس قسم کے برے کلمات نکال کر (وہ مفت میں) گناہ گار ہوتے ہیں۔

رہا دوسرا طبقہ، یعنی اہل فقہ و نظر حضرات کا طبقہ، تو اس کا حال یہ ہے کہ اس کے اکثر افراد حدیث کے ساتھ کچھ یونہی سا لگاؤ رکھتے ہیں، نہ تو صحیح حدیثوں کو ضعیف حدیثوں سے علیحدہ کر پاتے ہیں، نہ کھری اور کھوٹی روایتوں کو پہچان کر دیتے ہیں۔ (احادیث سے ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ) اگر ان لوگوں کو اپنے اختیار کردہ مذہب اور اپنی محبوب رایوں کے موافق (بھی) کوئی حدیث مل جائے تو

---

[۵] "مقلوب" اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے الفاظ یا جملوں میں راوی نے اپنی غلطی سے تقدیم و تاخیر کردی ہو۔ (مترجم)

وہ اس سے اپنے مخالفوں کے خلاف حجت قائم کرنے کی کوئی پروا نہیں رکھتے۔ حدیث کے رد و قبول کے بارے میں ان لوگوں نے باہم یہ طے کر رکھا ہے کہ ضعیف اور منقطع روایتیں بھی) ـــــ اگر وہ اپنے ائمہ اور شیوخ کے درمیان مشہور و مقبول رہی ہوں تو ـــــ قبول کر لی جائیں، خواہ ان کی بنیاد کتنی ہی ناپائیدار اور ان کی صحت کتنی ہی موہوم کیوں نہ ہو۔ یہ "رای" کی ایک (کھلی ہوئی) لغزش اور نارسائی ہے۔

پھر (ان لوگوں کی ایک عجیب و غریب ستم ظریفی یہ ہے کہ) اگر ان کے سامنے، ان کے مذہب کے کسی بڑے شخص، اور ان کے اسکول کے کسی ممتاز لیڈر کا اجتہاد کیا ہوا کوئی قول بیان کیا جاتا ہے تو اس کو قبول کر لینے کے لیے تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس قول کے راویوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد راوی کون ہے (بس اسی کی روایت کو لیتے ہیں) غرض اس قول کے قول امام ہونے کی بابت تحقیق کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ مالکیوں کو تم پاؤ گے کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں صرف انہی اقوال کو معتبر مانتے ہیں جو ابن قاسم، اشہب اور انہی کے ہم پایہ دوسرے مالکی علمائے عظام کے روایت کردہ ہوں، اور اگر عبد اللہ ابن عبد الحکیم جیسے (نسبۃً کم درجے کے) علما کے ذریعہ، (ان بڑے علما کی روایتوں کی مخالف) کوئی روایت ہم پہنچی ہو تو اس کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کے پیرو، امام موصوف کے صرف انہی اقوال کو قبول کرتے ہیں جو امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن اور ان ہی کے مانند امام اعظم کے دیگر بلند مرتبہ تلامذہ کے نقل کیے ہوئے ہوں۔ ان اقوال کی روایت کو قبول و اعتبار کا شرف استحقاق کبھی نہیں بخشتے جو حسن بن زیاد لولوی اور ان سے کم درجہ کے لوگوں کے واسطے سے ملے ہوں اور مذکورہ بالا نامور علمائے احناف کی روایتوں کے خلاف پڑتے ہوں۔ شوافع کا بھی یہی حال ہے، یہ لوگ اقوال شافعی میں سے صرف انہی اقوال کو تسلیم کرتے ہیں جو مزنی اور ربیع ابن سلیمان مرادی کے روایت کیے ہوئے ہوں، اور اگر حرملہ اور بحتری وغیرہ (جیسے فروتر مرتبے کے شافعی علما) نے امام ممدوح کا کوئی قول (ان اقوال کے خلاف) نقل کیا ہو تو اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے، حتی کہ اس کو اقوال شافعی میں شمار کرنے

کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ الغرض اپنے ائمہ اور اساتذہ کے احکام مذاہب (کے قبول و عدم قبول) میں ہر فرقہ کے اہل علم کا یہی دستور ہے۔ پس اگر ان جزئیات میں، اور ان ائمہ کے اقوال کی روایتوں میں، ان "اصحاب فقہ و نظر" (کی تحقیق و احتیاط) کا یہ عالم ہے کہ ان کو قبول کرنے کے لیے ان کی صحت کا پختہ اور قابل اعتماد ہونا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے یہ کس طرح جائز ہے کہ وہ صرف اس سے اہم تر بلکہ سب سے اہم ترین معاملہ میں سہل انگاری سے کام لیں اور اس امام کے ارشادات کے نقل و بیان میں (روایات کی قوت اور ضعف، اور راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کا لحاظ کیے بغیر کچھ لوگوں کے ذاتی رجحانات پر) تکیہ کر لیں، جو تمام اماموں کا امام اور اللہ رب العزت کا نمائندہ ہے، جس کی تعمیل ارشاد ہمارے لیے فرض، اور جس کی طاعت گزاری ہر ایک استثنا سے بالاتر ہے، جس کے فرمان کے آگے سر تسلیم جھکا دینا اور جس کے حکم کو بجا لانا ہمارے لیے ضروری ہے، ایسا ضروری کہ اس کے فیصلوں کے خلاف ہمارے اپنے دلوں میں کوئی تنگی، اور اس کے فرامین کی طرف سے اپنے سینوں میں کوئی جذبۂ عناد محسوس کرنا موجب ہلاکت ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ اگر ایک آدمی اس بات کا مجاز ہے کہ وہ اپنے نجی معاملہ میں غفلت اور بے پروائی سے کام لے اور اپنے قرض خواہوں سے معاملہ کرنے میں اپنے حق کو مساحت کی نذر کر دے، مثلاً ان سے لے تو کھوٹی چیز، مگر اداے قرض میں دے انھیں کھری چیز، تو کیا اس کو کسی دوسرے کے حق کے بارے میں بھی اس طرز عمل کا مجاز گردانا جا سکتا ہے، جب کہ وہ صرف اس کا نائب بنایا گیا ہو؟ مثلاً کسی ضعیف کا ولی ہو، یا کسی یتیم کا وصی، یا کسی شخص نامو جود کا وکیل۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اس وقت ایسا کرے گا تو اس کا یہ فعل صریح خیانت اور عہد شکنی قرار پائے گا لیکن بعینہٖ یہی طرز عمل ہے جو حدیث کے بارے میں اختیار کیا گیا، بچشم سر یا بچشم دل جس طرح بھی تم چاہو، اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہو۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ گروہوں نے اس جادۂ حق کے طے کرنے میں دقت محسوس کی اور دیکھا کہ اس طور پر (احکام شریعت کے علم سے) بہرہ مند ہونے کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہے۔ درانحالیکہ وہ چاہتے یہ تھے کہ منزل مقصود پر جلد جا پہنچیں، اس لیے انھوں نے تحصیل علم کے طریقہ کو مختصر کر لیا، اور چند محدود باتوں اور اصول فقہ کے معاف

سے نکلی ہوئی کچھ مخصوص چیزوں کو اپنے لیے کافی سمجھ لیا، جن کا نام انھوں نے "علم" رکھا اور اس لیے تاکہ ہم بھی علم کے پانچوں سواروں میں گنے جائیں، ان "حقائق عالیہ" کو اپنی دستارِ فضیلت کا طرۂ امتیاز بنا یا۔ اب وہ ان کے لیے ایک ڈھال ہیں جس کو اپنے مخالفین کے ساتھ ہم نبرد ہونے کے وقت وہ استعمال کرتے ہیں، ایک ٹٹی ہیں جس کی آڑ میں موشگافیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا طوفان اٹھاتے ہیں۔ انہی کے ذریعہ مناظرے کے میدان گرم کرتے ہیں اور ان ہی کے اوپر ہاہم ہاتھا پائی ہوتی ہے، اس کے بعد جب میدان مناظرہ سے باہر تشریف لائی جاتی ہے تو اس شخص کے سر پر دانائی اور بزرگی کا سہرا باندھ دیا جاتا ہے جو اس معرکہ میں بازی لے گیا ہو۔ اب وہی اپنے وقت کا نامور فقیہ ہے اور وہی اپنے مقام کا عالی مرتبہ امام۔

یہ تو رہا ایک طرف، پھر (اس پر مزید برآں) یہ کہ شیطان نے چپکے سے ان کے دلوں میں ایک لطیف حیلہ ڈال دیا اور ان کو ایک کاری فریب میں لا پھنسایا یعنی انھیں یہ پٹی پڑھائی کہ یہ جو تمھارے پاس علم کا سرمایہ ہے وہ بہت ہی کم اور حقیر ہے جس سے تمھاری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اور نہ وہ تمھارے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ اسے علم کلام سے اس کو تقویت دو اور ادھر ادھر کے کچھ کلامی مباحث کا اس میں پیوند لگاؤ اور متکلمین کے پر پیچ اصولوں کو اس کا پشت پناہ بناؤ، تاکہ ان کے آگے غور کی شاہراہ باز، اور فکر کا میدان وسیع ہو سکے۔ (افسوس کہ) شیطان کا خیال پورا ہو کر رہا اور مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کو چھوڑ کر باقی سب نے اس کی اطاعت اور پیروی اختیار کر لی۔ حیرت ہے ان لوگوں پر اور ان کی عقلوں پر! (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ) شیطان لعین انھیں کہاں لیے جا رہا ہے؟ اور ان کے اصل مقصود اور مرکزِ ہدایت سے ہٹا کر انھیں کس کھڈ میں ڈال گیا ہے؟ اللہ ہماری مدد کرے۔"

(باقی)

رسائل و مسائل

گائے، تناسخ اور گرنتھ صاحب

سوال :- حسب ذیل امور کے متعلق اپنی معلومات کی روشنی میں حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائیے:

(۱) گائے کی تعظیم و تقدیس جو ہندو بھائیوں میں رائج ہے۔ اس کی وجہ سے سیکڑوں دفعہ ہندو مسلم فسادات واقع ہو چکے ہیں۔ آخر یہ کیا سحوریت ہے کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے معقول عالم موجود ہیں لیکن کوئی اس مسئلہ کی نوعیت پر غور نہیں کرتا حتیٰ کہ گاندھی جیسے فہمیدہ اور جہاندیدہ لیڈر بھی مذہبیت کی اسی کشتی پر سوار ہیں جسے عوام نے ایسے ہی چند مسائل پر جوڑ ملا کر تعمیر کیا ہے۔ آپ اس گائے کی پوجا پر روشنی ڈالیں اور واضح کریں کہ یہ کب سے شروع ہوئی اور کیسے پھیلی تو ممکن ہے کہ کچھ حق پسند ہندو مطمئن ہو جائیں اور اپنی قوم کی اصلاح کریں۔

(۲) تناسخ کا عقیدہ ہندو قوم کے ہاں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوؤں کے سوا کوئی دوسری قوم بھی اس کی قائل ہوئی ہے یا نہیں۔ تاہم یہ عقیدہ بھی سنجیدہ تنقید کا مستحق ہے۔

(۳) سکھ قوم کی مذہبی کتاب "گرنتھ" صرف اخلاقی پند و نصائح کا مجموعہ ہے اور اس کی بجا طور پر موضوع کے لحاظ سے گلستاں، بوستاں وغیرہ کتابوں کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب کے صالح اور صوفی منش بزرگوں کے ارشادات و نصائح اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ کتاب کو مدون کرنے والے کا منشا کچھ اور معلوم ہوتا ہے مگر اس منشا کے بالکل خلاف اب یہ ایک قوم کی الہامی کتاب بن گئی ہے۔ حالانکہ اس میں نہ تو تمدنی مسائل سے بحث ہے، نہ معاشرت سے کوئی سروکار، نہ معاشیات و سیاسیات میں اس سے کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ مگر میری عقل کام نہیں کرتی کہ تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ تک کیونکر اس پر مطمئن ہیں۔؟

جواب: آپ نے جو استفسارات کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک مفصل بحث چاہتا ہے لیکن میرے لیے اس وقت ان چیزوں پر تفصیلی بحث کرنا مشکل ہے۔ نمبروار تینوں مسئلوں پر مختصراً اظہار خیال کرتا ہوں:-

(۱) ہندو مذہب کے متعلق میری معلومات اتنی زیادہ وسیع نہیں ہیں کہ میں اس کے کسی مسئلہ پر تحقیقی بحیثیت کرسکوں، اور بغیر کافی معلومات کے کسی چیز پر بحث و تنقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ جو تھوڑی بہت واقفیت مجھے حاصل ہے اس کی بنا پر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ قدیم عہد میں جس کو ویدک عہد کہا جاتا ہے، گائے کی تقدیس کا عقیدہ موجود نہ تھا، یا اگر تھا تو بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ چنانچہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ اس دور میں ہندو گائے کی قربانی کیا کرتے تھے۔ علم الاقوام کی رو سے بھی یہ ثابت ہے کہ قدیم آریہ قوم خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب سے تعلق رکھتی تھی جس میں گاؤ پرستی قطعاً مفقود تھی۔ بعد میں اس کا سابقہ اس مادری تہذیب سے ہوا جو ہندوستان کی دراوڑی قوموں اور عراق، مغربی ایشیا اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی، اس تہذیب کی حامل اقوام زراعت پیشہ تھیں، اور ان میں گائے کی تقدیس پائی جاتی تھی۔ پس تحقیق اسی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کو مصر سے گائے پرستی کی چھوت لگی، اسی طرح قدیم آریوں کو بھی یہ چھوت ہندوستان آکر لگی ہے۔ جہاں تک گائے کی پوجا کا تعلق ہے وہ تو ہندوؤں کے ایک خاص طبقہ میں ہی پائی جاتی ہے، لیکن اس کی تقدیس پوری ہندو قوم میں پھیلی ہوئی ہے، بلکہ جو لوگ ہندوؤں سے نکل کر اسلام یا عیسائی مذہب میں داخل ہوئے ہیں ان کے بھی ایک اچھے خاصے عنصر میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر محض اس لیے پایا جاتا ہے کہ ان کی تبدیلئ ذہن پوری طرح نہیں ہوئی۔

خاص طور پر اس عقیدہ کی تردید کے لیے کچھ کہنا غالباً مفید نہ ہوگا، کیونکہ ایک غلط عقیدہ بہت سے دوسرے غلط عقائد کے ساتھ ہم رشتہ ہوتا ہے اور ایک ان سب کی اصل جڑ ہوا کرتی ہے۔ جب تک اصل اور شاخوں کے پورے سلسلے کی اصلاح نہ کی جائے، محض کسی ایک شاخ کو درست کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے تمام غلط عقائد کی جڑ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے نظام اور اس میں اپنے صحیح مقام اور مالک کائنات کے ساتھ اپنے اور دوسری موجودات کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے

اس ابتدائی اور بنیادی غلط فہمی سے نتیجے کے طور پر بے شمار غلط فہمیوں کا ایک سلسلہ پیدا ہوتا ہے جو سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہیں، اور ایک پورا نظام فکر اور نظام زندگی پیدا کر دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس بات کو سمجھ لے کہ اس ساری کائنات کا ایک ہی خالق اور ایک ہی مالک و متصرف اور ایک ہی حاکم و مدبر ہے، اور انسان دنیا میں اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے، اور دنیا کی ساری چیزیں انسان کے لیے خادم بنائی گئی ہیں، تو ایسا شخص شرک اور مخلوق پرستی اور مادی یا روحانی یا خیالی چیزوں کی تقدیس کے ہر شائبہ سے خود بخود پاک ہو جائے گا اور اس کے دل میں ایک خدا کے سوا کسی کی عبودیت اور کسی کی تقدیس کے لیے جگہ باقی نہ رہے گی۔ پھر اگر کسی شخص میں صحیح قسم کا معقول پسندانہ رویہ (True Rationalism) موجود ہو تو وہ موروثی تعصبات اور قومی و نسلی تعصبات اور شخصی و نفسانی تعصبات سے خود بخود خالی ہو جائے گا اور اپنے فکر اور اپنے عمل کو پوری بے لوثی کے ساتھ اس طریقہ پر قائم کرے گا جو سراسر معقول ہو۔

آپ کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے معقول آدمی موجود ہیں جو وسیع علم اور وسیع نظر رکھتے ہیں مگر پھر بھی ان عقائد اور خیالات میں مبتلا ہیں جو سرسری نظر میں بھی جاہلیت کے عقائد اور خیالات محسوس ہوتے ہیں۔ اس قسم کا تعجب آپ نے آخری سوال کے سلسلہ میں بھی ظاہر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صورت حال محض کسی ایک قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ دنیا میں بہت سے غلط فکری اور اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پیرووں میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اور نہایت ذکی و فہیم اور اپنے مسلک کی مخصوص گمراہیوں کے سوا دنیا کے تمام دوسرے معاملات میں غایت درجہ معقول ہوں گے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کا ایسی ایسی گمراہیوں میں مبتلا ہونا جن میں سے بعض تو ان کے مخصوص مسلک کو ماننے والوں کے سوا دوسرے تمام لوگوں کو صریحاً غیر معقول محسوس ہوتی ہیں، البتہ ہر ایک حیران کن معاملہ نظر آتا ہے۔ مگر اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں رہتی۔ اس صورت حال کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انسانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی عقل اور علم کے استعمال کو زیادہ تر اپنے دنیوی کاروبار اور اپنی جسمانی زندگی

کے معاملات و مسائل تک محدود رکھتے ہیں اور اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے کہ جن فکری و اخلاقی بنیادوں پر انھوں نے اپنی زندگی کو تعمیر کر رکھا ہے، یا جن بنیادوں پر تعمیر شدہ زندگی انھوں نے پہلے سے پائی ہے، ان کے متعلق تحقیق کر لیں کہ وہ بجائے خود صحیح بھی ہیں یا نہیں اور ان سے بہتر بنیادیں، کہیں ان کو مل سکتی ہیں یا نہیں۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں میں بہت ہی کم آدمی ایسے ہیں جو نسلی، قومی، شخصی اور نفسانی تعصبات سے آزاد ہو کر خالص علمی تحقیق اور خالص معقولیت پر اپنے طرزِ فکر و عمل کی بنا رکھنے کے لیے آمادہ ہوں، اگرچہ اس کے مدعی آپ کو بہت ملیں گے۔

(۲) تناسخ کا عقیدہ ہندوؤں کے سوا بعض دوسری قوموں میں بھی پایا گیا ہے اور اب بھی پایا جاتا ہے، اور ہندوستان سے باہر بھی بعض فلسفیانہ نظاموں میں اس کا نشان ملتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں جتنی زیادہ گہری جڑیں اس نے پکڑی ہیں اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس عقیدہ کی اصل وہ دو سوال ہیں جن کو انسان نے ہمیشہ حل کرنے کی کوشش کی ہے اور جو اکثر اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں آدمی کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ دنیا میں مصائب اور آفات (جن میں موت بھی شامل ہے) کیوں پائے جاتے ہیں۔ سراسر راحت، لذت، خوشی، سلامتی و عافیت اور ابدی زندگی ہی کیوں نہیں ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ انسانی اعمال کے طبعی نتائج تو دنیا میں ایک مقرر ضابطہ کے تحت نکلتے نظر آتے ہیں، لیکن اخلاقی نتائج (جن کے ظاہر ہونے کا انسانی فطرت آپ سے آپ مطالبہ کرتی ہے) کیوں ایک مقرر ضابطہ کے مطابق ظاہر نہیں ہوتے؟ اگر وہ سب یا ان کا ایک جز ظاہر ہونے کے لیے رکا ہوا ہے تو اس کے ظہور کی شکل کیا ہے؟

ان دونوں سوالات کے بہت سے مختلف جوابات مختلف فلسفیانہ نظاموں سے ملتے ہیں مگر ان سب پر اس مختصر جواب میں بحث نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان کے فلاسفہ نے، جن کے تصورات آگے چل کر مذاہب کی شکل اختیار کر گئے، ان سوالات کو کرم اور تناسخ کے عقیدوں کی شکل میں حل کیا ہے وہ اس دنیا کو دارالامتحان کے بجائے ایک دارالعذاب اور ایک طرح کے جیل خانہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، حیاتِ جسمانی کو فی الاصل مصیبت قرار دیتے ہیں، جسم اور جسمانیات کے ساتھ انسان کے

تعلق کو اس بات کی وجہ قرار دیتے ہیں کہ روح قید جسم سے چھوٹ چھوٹ کر بار بار پھر اسی قید خانہ میں واپس آتی ہے۔ مصائب اور آفات اور آلام کو، نیز خوش حالیوں اور کامیاب زندگیوں کو ان برے یا اچھے اعمال کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جو روح نے اُس وقت کیے تھے جب وہ موجودہ زندگی سے پہلے قید جسم میں تھی، اور اُن کے نزدیک اعمال کے اخلاقی نتائج (جو ایک زندگی میں پوری طرح یا اپنی اصلی شکل میں ظاہر نہیں ہوتے) کے ظہور کی صورت یہی ہے کہ انسان اسی دنیا میں دوبارہ آکر ان کو وصول کرے۔

یہ ایک وسیع نظام فکر ہے جس کا محض ایک خلاصہ میں نے یہاں بیان کیا ہے۔ یہ پوری زندگی کے متعلق انسان کے نقطۂ نظر اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اس کے رویہ کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے تمام فکری وعملی نتائج پر یہاں بحث کرنا مشکل ہے۔ میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ دراصل یہ قیاسی فلسفوں (Speculative Philosophies) کے قبیل کی چیز ہے اور تمام قیاسی فلسفوں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے سامنے جو مسائل آتے ہیں ان کو وہ محض تخیل اور منطق اور اٹکل سے کسی ایسے طور پر حل کر لینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کو اپنی حد تک اپنے پیش نظر مسائل کا اطمینان بخش اور دل کو لگتا ہوا جواب مل جائے، قطع نظر اس سے کہ علم، تجربہ، مشاہدہ، اور آثار کائنات سے اس کی کوئی شہادت ملے یا نہ ملے۔ قیاسی فلسفی اس شہادت کی سرے سے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ اُسے تو فقط اپنے پیش نظر سوالات کا ایسا جواب درکار ہوتا ہے جس پر وہ اور اس کے طرز پر سوچنے والے لوگ مطمئن ہو جائیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ایسے قیاسات کا امر واقعی اور حقیقت نفس الامری کے مطابق ہونا کچھ ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کی بہت کم توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تو ایک تیر ہے جو اندھیرے میں اٹکل سے چلایا جاتا ہے۔ نشانے پر لگے یا نہ لگے۔ تیر چلانے والے کو خود بھی اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتا کہ کسی جگہ اس کے لگنے سے "کھٹ" کی آواز بھی آتی ہے یا نہیں۔ اس کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اپنے قیاس سے اس نے جس کو نشانہ کا صحیح رخ سمجھا ہے اُدھر اس نے اپنی حد تک ٹھیک ٹھیک شست باندھ کر تیر چلا دیا۔ ایسی تیر اندازی کا نشانہ پر لگنا جتنا کچھ متوقع ہو سکتا ہے، اتنی ہی کچھ قیاسی فلسفوں کے مطابق حقیقت ہونے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔

بہت سے قائلینِ تناسخ خود بھی اپنے عقیدہ کی اس خامی کو محسوس کرتے ہیں، اور اسی کی تلافی کی کوشش ہے جو کبھی کبھی اخبارات میں کسی ایسی بچی یا بچے کے ظہور کی اطلاع کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے جو اپنے پچھلے جنم کے حالات سناتی یا سناتا ہے۔ لیکن اوّل تو یہ ایک عجیب ... ہے کہ ایسے بچے صرف ہندوؤں ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور ہندو اخبارات تک ہی ان کی خبر پہنچتی ہے۔ دوسری اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے فلسفہ کی تائید میں تجربہ و مشاہدہ کے فقدان کی تلافی کے لیے کہیں ایک آدھ ایسے بچے کی پیدائش کو کافی سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ان کے نظریہ کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ سارے ہی بچے ایسے پیدا ہوں۔ اگر وہ سزا یا جزا جو انسان کو ایک جنم کے اعمال کی بنا پر دوسرے جنم میں ملتی ہے، طبعی جزا و سزا نہیں بلکہ اخلاقی جزا و سزا ہے تو ہر انسان کو اس کا شعور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ کس چیز کی جزا یا سزا پا رہا ہے، کیونکہ تمام اخلاقی اعمال لازمی طور پر شعوری اعمال ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ بھی لازماً شعوری ہونا چاہیے۔

اس طریق کے برعکس جن لوگوں نے عقل اور اس کے مطالبات، اور فطرت اور اس کے تقاضوں اور آثارِ کائنات اور اس کے اشاروں کو نظر انداز کرکے ٹھیٹھ ظاہر بینی کے ساتھ، اور ایک بڑی تنگ نظرانہ طرزِ فکر سے انکار کی خواہش کے ساتھ، تجربہ و مشاہدہ پر اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے، انھوں نے پہلے سوال کی کنہ کو پہنچنے کی تو ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ اپنی تحقیق و رائے کو "کیوں ہے" کے سوال کے بجائے بڑی حد تک صرف "کیا ہے" کے سوال تک محدود رکھا۔ رہا دوسرا سوال، تو اس کے متعلق انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے نفس کو اس جواب ہی پر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سارے اخلاقی نتائج بس اسی دنیا کی ایک ہی زندگی میں ظاہر ہو لیتے ہیں جو موت پر ختم ہو جاتی ہے، اور اگر بالفرض وہ ظاہر نہیں ہوتے تب بھی بہرحال موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے کیونکہ وہ براہِ راست ہمارے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آتی۔ لیکن انسان خواہ کتنی ہی کوشش کرے اس جواب سے اس کے قلب کا اطمینان کسی طرح ممکن نہیں۔

اب رہا یہ امر کہ انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دین میں ان دونوں سوالات کا کیا جواب ہے اور وہ کن دلائل سے معقول ترین جواب ہے، تو اس پر میں اپنے مضامین مثلاً رسالہ دینیات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، زندگی بعد موت، اسلام اور جاہلیت، اور تفسیر سورہ اعراف میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں لہٰذا یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ بات واضح کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمام مابعد الطبیعاتی مسائل میں یہ اصول مشترک ہے کہ ان کا کوئی حل بھی، خواہ وہ نفی کی شکل میں ہو یا اثبات کی شکل میں، ایسا قطعی الثبوت نہیں ہو سکتا جیسے دو اور دو کا چار ہونا قطعی الثبوت ہے کہ اس کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایسے مسائل کا زیادہ سے زیادہ معقول حل، جس کے مطابق حقیقت ہونے کا اغلب گمان کیا جا سکتا ہو، صرف وہی ہو سکتا ہے جو عقل اور فطرت کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کو پورا کرتا ہو، آثار کائنات اور تجربات و مشاہدات میں جس کی طرف واضح اشارات پائے جاتے ہوں، جس سے زندگی کے ان تمام مسائل کو حل کیا جا سکتا ہو جو اس خاص مسئلہ سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے ہوں، جس پر عقلاً کسی اعتراض کی گنجائش نہ ہو، جس کے مان لینے سے کچھ دوسرے ناقابل حل مسائل نہ پیدا ہوتے ہوں، جس کے ماننے سے کچھ ایسی قباحتیں نہ پیدا ہوتی ہوں جنہیں کسی دوسرے طریقے سے رفع کرنا ممکن نہ ہو، اور جس کے خلاف کوئی ثبوت نہ دیا جا سکتا ہو۔ عقل زیادہ سے زیادہ ان سوالات کے کسی حل کو اغلب (most probable) سمجھنے کی حد تک ہی ہمیں لے جا سکتی ہے۔ اس کے آگے یقین حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ایسا حل پیش کرنے والوں کی زندگیوں کو، ان کے پیش کردہ پورے نظام فکر و عمل کی معقولیت کو اور ان کے کام اور اس کے نتائج کو دیکھ کر ان پر ایمان بالغیب لایا جائے۔

(۳) گرنتھ صاحب کا مطالعہ میں نے خود تو نہیں کیا ہے لیکن جس حد تک میں نے مطالعہ کرنے والوں سے معلومات حاصل کی ہیں، ان کی بنا پر میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ سکھ مذہب محض ایک صوفیانہ مذہب ہے اور اس میں انسان کی زندگی کے بڑے بڑے مسائل مثلاً تمدن و معاشرت، سیاست و معیشت، عدالت و قانون، صلح و جنگ، وغیرہ کے متعلق کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں ہے جس پر دنیا میں ایک سوسائٹی اور ایک اسٹیٹ کی تعمیر ہو سکے۔ لیکن جس وجہ سے سکھوں کا تعلیم یافتہ اور صاحب فکر و فہم گروہ تک اپنی جستجوئے حق اور تلاش ہدایت کو معطل کیے ہوئے اس مذہب پر قانع ہے اس کی تشریح میں پہلے سوال کے جواب میں کر چکا ہوں۔

سنت اور عاداتِ رسول کا اصولی فرق

سوال: آپ نے مظاہر تقویٰ پر اپنے خیالات کی توثیق فرماتے ہوئے سنت و بدعت کے بارے میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ:

> "سنت و بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو میں غلط بلکہ دین میں تحریف سمجھتا ہوں جو آپ کے ہاں رائج ہیں"

عرض ہے کہ یہ مسئلہ دراصل اصولی ہے۔ اس پر اگر اطمینان بخش فیصلہ ہو جائے تو بہت سے جزوی مسائل، بلکہ اکثر نزاعات اور ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں۔ لہٰذا سنت اور عادت کی ایسی جامع تعریف فرما دیجیے جو مانع بھی ہو اور اس کے ساتھ ہی بدعت کے متعلق بھی اپنی تحقیق سے ممنون فرمائیں۔ مزید توضیح مقام کے لیے عرض ہے کہ آپ کا ارشاد کہ:

> "آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی داڑھی رکھنا سنت رسول یا اسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے۔"

میرے حسب حال نہیں ہے۔ اگرچہ میں مطلق اعفاء اللحیہ کو سنت رسول سمجھتا ہوں، مگر اسے غرض بعثت و مقصد رسالت آج سے دس سال قبل بھی نہیں سمجھتا تھا اور نہ اب ہی۔ میں تو یقین رکھتا ہوں کہ مقصد بعثت فقط ایک ہی سنت ہے اور وہ ہے "اقامت دین" یا قیام اطاعت الٰہیہ۔ باقی امور علی حسب المدارج اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سنت کے ہم پلہ دیگر سنن تو کیا، فرائض شرعیہ مثلاً عمارت مسجد حرام اور سقایۃ الحاج وغیرہ امور بھی نہیں ہیں، اور میرے نزدیک یہی وہ سنت ہے جس کے احیا کو مأۃ شہید کے اجر کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں حضور کے ذاتی اسوہ اعفاء لحیہ وغیرہ کو سنت مالبد نفرنفس الشرعیہ تا حال سمجھتا ہوں اور اسی کی توثیق یا تصحیح کے لیے فوق الصدر استفسار پیش خدمت ہے۔

جواب: سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے۔ لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا اور اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کیے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز سنت ہے اور کونسا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ اصولی طور پر یوں سمجھیے کہ انبیاء علیہم السلام انسان کو اخلاق صالحہ کی تعلیم دینے اور زندگی کے ایسے طریقے سکھانے کے لیے آتے ہیں جو فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا کے ٹھیک ٹھیک منشا کے مطابق ہوں۔ ان اخلاق صالحہ اور فطری طریقوں میں ایک چیز تو اصل و روح کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسری چیز قالب و مظہر کی حیثیت۔ بعض امور میں روح اور قالب دونوں اسی شکل میں مطلوب ہوتے ہیں جس شکل میں نبی اپنے قول و عمل سے ان کو واضح کرتا ہے۔ اور بعض امور میں روح اخلاق و فطرت کے لیے نبی اپنے مخصوص تمدنی حالات اور اپنی مخصوص افتاد مزاج کے لحاظ سے ایک خاص عملی قالب اختیار کرتا ہے اور شریعت کا مطالبہ ہم سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اس روح اخلاق و فطرت کو اختیار کرلیں، رہا وہ عملی قالب جو پیغمبر نے اختیار کیا تھا تو اسے اختیار کرنے یا نہ کرنے کی شرعاً ہم کو آزادی ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے معاملات میں سنت روح اور قالب دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، اور دوسری قسم کے معاملات میں سنت صرف وہ روح اخلاق و فطرت ہے جو شریعت میں مطلوب ہے نہ کہ وہ عملی قالب جو صاحب شریعت نے اس کے اظہار کے لیے اختیار کیا۔ مثال کے طور پر دین کا منشا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر کریں۔ اس کے لیے نبی نے بعض اعمال تو ایسے اختیار کیے جن کی روح اور عملی قالب دونوں سنت ہیں اور دونوں کی پیروی ہم پر لازم ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور بعض طریقے آپ نے ایسے اختیار کیے جن کی روح کو تو اپنے اعمال میں ظاہر کرنا ضروری ہے لیکن قالب کی ہو بہو پیروی کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ ہم کو آزادی دی گئی ہے کہ ہم اس روح کے ظہور کے لیے جو عملی قالب

مناسب سمجھیں اختیار کریں۔ مثلاً دعائیں، اور وہ ماثور اذکار جو حضور وقتاً فوقتاً کرتے تھے۔ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم ٹھیک انہی الفاظ میں دعائیں مانگیں جن الفاظ میں حضور مانگتے تھے۔ البتہ سنت نبوی کی پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان دعاؤں کے طرز اور ان کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھیں اور جن الفاظ میں بھی دعائیں مانگیں ان کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی روح موجود ہو۔ اسی طرح اذکار میں سنت کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے مختلف حالات و اعمال میں خدا کو یاد کرتا رہے، اس سے استعاذہ کرے، اس سے مدد مانگے، اس کا شکر ادا کرے اور اس سے طلب خیر کرے۔ اس سنت کو حضور نے اپنی عملی زندگی میں ان مختلف اذکار کے ذریعہ سے ظاہر اور جاری کیا جو حدیثوں میں مذکور ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اذکار کو لفظ بلفظ یاد کر کے اسی طرح ان کا التزام کرے جس طرح حدیث میں بیان ہوا ہے تو یہ مستحسن یا مستحب تو ہو سکتا ہے لیکن اسے اتباع سنت کا لازمی تقاضا نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس سنت کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے کسی دوسرے طریقہ سے اس پر عمل درآمد کرے اور اس کے لیے دوسرے الفاظ اختیار کرلے تب بھی وہ بدستور متبع سنت رہے گا اور اس پر خلاف ورزی سنت کا الزام عائد نہ ہوگا۔ یہی فرق تمدنی اور معاشرتی حالات میں بھی ہے۔ مثلاً لباس میں جن اخلاقی و فطری حدود کو قائم کرنا نبی کے مقاصد بعثت میں تھا وہ یہ ہیں کہ لباس ساتر ہو، اس میں اسراف نہ ہو، اس میں تکبر کی شان نہ ہو، اس میں تشبہ بالکفار نہ ہو وغیرہ۔ اس روح اخلاق و فطرت کا مظاہرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس لباس سے کیا اس میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کی پیروی جوں کی توں کرنی چاہیے، جیسے ستر کے حدود اور اسبال ازار سے اجتناب اور ریشم وغیرہ کے استعمال سے پرہیز، اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو نہ سنت بنانا مقصود تھا، نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرز خاص کا لباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے، اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لیے آیا کرتی ہیں کہ کسی شخص خاص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن، یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنت بنا دیں۔

سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات با آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں

تحریف واقع ہوتی ہے۔

اب خاص اس داڑھی کے معاملہ کو لے لیجیے جس پر اس بحث کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں جس روح اخلاق و فطرت کو اللہ تعالیٰ ہماری عملی زندگی میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ مونچھیں کم کی جائیں اور داڑھی بڑھائی جائے۔ اسی کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی اور یہ سنت ہے۔ اب رہی اس کی عملی صورت تو اس کا کوئی تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے نہیں فرمایا۔ حالانکہ کوئی امر اس میں مانع نہیں تھا کہ آپ اعفاء لحیہ کی مقدار اور قص شارب کی حد واضح طور پر مقرر فرما دیتے یا کم از کم یہی فرما دیتے کہ داڑھی اور مونچھ کی ٹھیک ٹھیک وہی وضع رکھو جو میری ہے جس طرح نماز کے متعلق حضورؐ نے فرما دیا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ پس جب کہ آپؐ نے اس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہیں کی اور صرف ایک عام ہدایت دے کر ہم کو چھوڑ دیا تو اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ روحِ اخلاق و فطرت اس معاملہ میں مطلوب ہے اس کا منشا پورا کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی اور ضروری ہے کہ آدمی داڑھی رکھے اور مونچھ کم کرے۔ اگر کوئی مقدار بھی اس کے ساتھ ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا بھی حضورؐ کے مشن کا کوئی جزو ہوتا تو آپ ہرگز اس کے تعین میں کوئی کوتاہی نہ کرتے۔ مجمل حکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملہ میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے، کہ وہ اعفاء لحیہ اور قص شارب کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں اختیار کریں۔ اب اگر ایک شخص مونچھوں کے بال مونڈ ڈالتا اور دوسرا شخص انھیں اس حد تک کتر ڈالنا چاہتا ہو کہ کھانے اور پینے میں مونچھوں کے بال آلودہ نہ ہوں، تو ان دونوں کو اپنے عمل میں آزادی ہے۔ اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرے نزدیک حکم کا منشا اس طریقے سے پورا ہوتا ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی اس رائے کو تمام دوسرے انسانوں کے لیے شریعت بنانے کی کوشش کرے اور اس کے خلاف جو شخص عمل کر رہا ہو اس کو ملامت کرے۔ اگر وہ اسے شریعت بنانے کی کوشش کرے گا اور اس کے خلاف عمل کرنے والوں کو ملامت کرے گا تو یہ بدعت ہوگی، کیونکہ جو چیز سنت نہیں ہے اس کو وہ زبردستی سنت بنا رہا ہے۔ سنت صرف قص شارب ہے نہ کہ اس کی کوئی خاص صورت جو کسی شخص نے اپنے استنباط و اجتہاد سے یا اپنے رجحان طبع سے اختیار کی ہو۔ اسی طرح داڑھی کے معاملہ میں جو شخص حکم کا منشا سمجھتا ہو کہ اسے

بلا نہایت بڑھنے دیا جائے وہ اپنی اس رائے پر عمل کرے، اور جو شخص کم سے کم یک مشت کو حکم کا منشا پورا کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہو وہ اپنی رائے پر عمل کرے۔ ان تینوں گروہوں میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ استنباط و اجتہاد سے جو رائے اس نے قائم کی ہے وہی شریعت ہے اور اس کی پیروی سب لوگوں پر لازم ہے۔ ایسا کہنا اس چیز کو سنت قرار دینا ہے جس کے سنت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور یہی وہ بات ہے جس کو میں بدعت کہتا ہوں۔

رہا یہ استدلال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھنے کا حکم دیا اور اس حکم پر خود ایک خاص طرز کی داڑھی رکھ کر اس کی عملی صورت بتا دی، لہٰذا حدیث میں حضورؐ کی جتنی اور جیسی داڑھی مذکور ہے اتنی ہی اور ویسی ہی داڑھی رکھنا سنت ہے، تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ نے ستر عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لیے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کر کے بتا دیا، لہٰذا اسی طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سنت ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو میرے نزدیک آج متبعین سنت میں سے کوئی شخص بھی اس سنت کا اتباع نہیں کر رہا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لیے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لیے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے :۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے، اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے، ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں:۔

قیمت حصہ اول ۰-۴-۱ حصہ دوم ۰-۸-۲ حصہ سوم ۰-۱۲-۱

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ — مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور ۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now. Price Rs. 3/-. Available from The Manager, Tarjuman ul-Quran, Jamalpur F. F., District Gurdaspur.

رسالۂ دینیات

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱/۸ محصولڈاک ۲ر خرچ وی پی ۳ر

دفتر رسالہ ترجمان القرآن، جمال پور - پٹھانکوٹ